وہ تم کو حسینؓ بناتے ہیں اور آپ یزیدی بنتے ہیں
یہ کیا ہی سستا سودا ہے دشمن کو تیر چلانے دو

مصنفہ

سیّدہ حفیظۃ الرحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ ونصلی علی رسول کریم

فَسَیَکفِیکھُم اللّٰہ وَھُوَ

السَمِیعُ العَلِیمُ

(سورۃ البقرہ، نمبر ۱۳۸)

نگینے لوگ

حصّہ دوئم

مصنفہ

سیّدہ حفیظۃ الرحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بَلٰیۤ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

(البقرۃ آیت ۱۱۲)

سچ یہ ہے کہ جو بھی اپنا آپ خدا کے سپرد کر دے اور وہ احسان کرنے والا ہو۔ تو اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور ان لوگوں پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

سو اے میرے پیارے بھائیو!! کوشش کرو تا کہ متقی بن جاؤ۔ بغیر عمل کے یہ سب باتیں ہیچ ہیں اور بغیر اخلاص کے کوئی عمل مقبول نہیں۔ سو تقویٰ یہی ہے کہ تمام نقصانوں سے بچ کر خدا تعالیٰ کی طرف قدم اٹھاؤ۔ اور پرہیزگاری کی باریک راہوں کی رعایت رکھو۔ سب سے اول اپنے دلوں میں انکساری پیدا کرو۔

(ازالۂ اوہام، ص ۵۴۷۔۵۴۶)
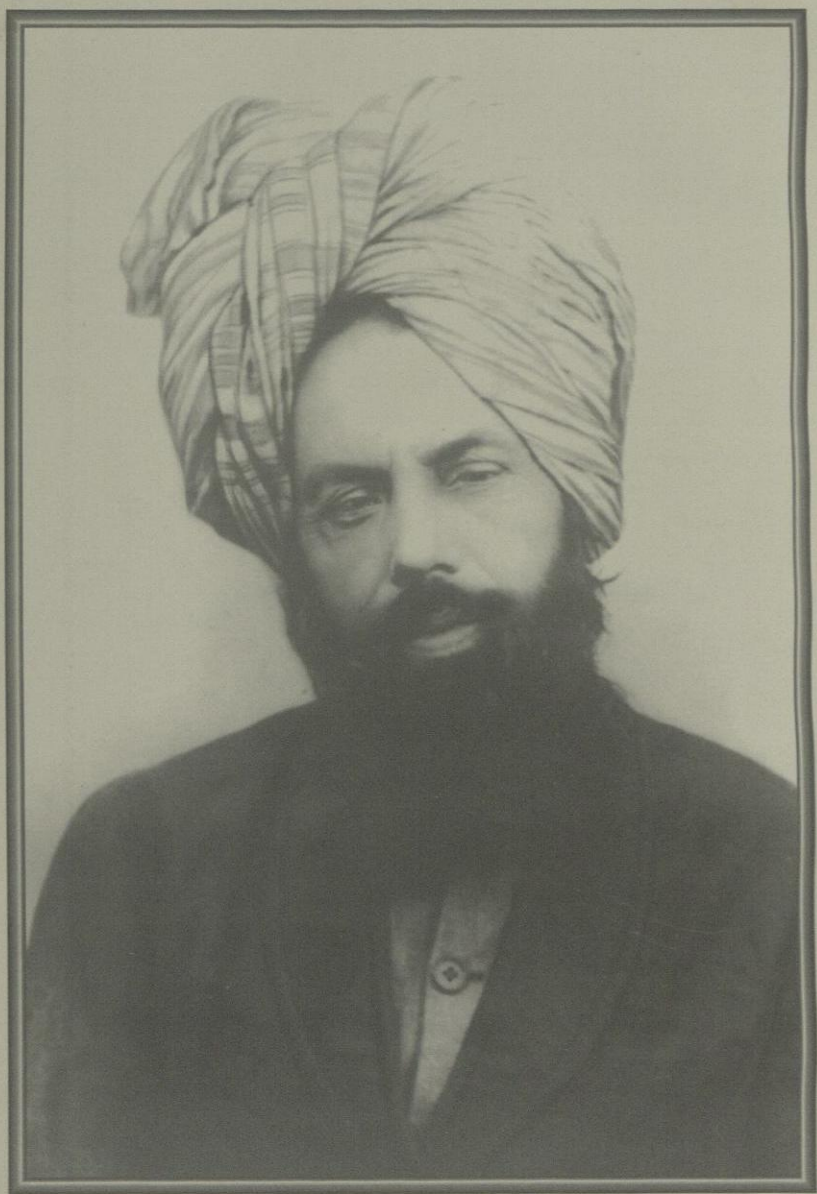
حضرت مرزا غلام احمد قادیانی امام مہدی و مسیح موعود علیہ السلام

اَلحَمدُ لِلّٰہِ وَسَلا مُ عَلٰی
عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اَصْطَفٰے

اے چھاؤں چھاؤں شخص تری عمر ہو دراز

آمین

بڑے چلو براہ دین خوشا نصیب کہ تمہیں

خلیفۃ المسیح سے امیرِ کارواں ملے
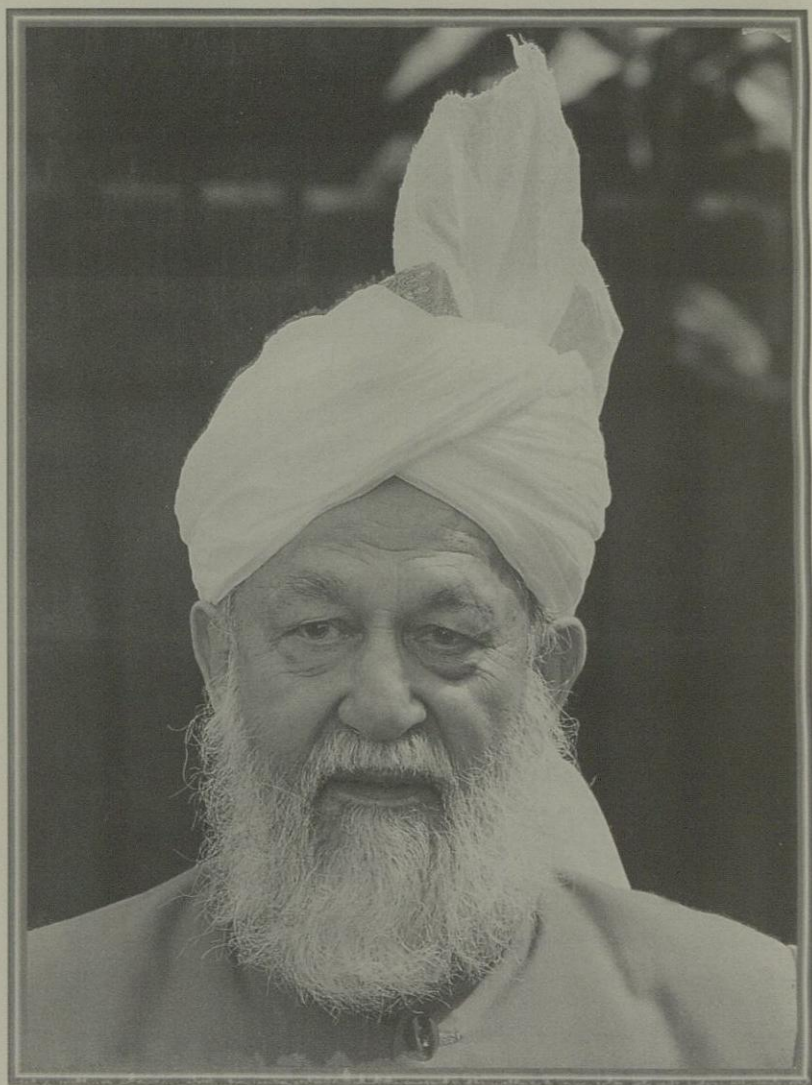
حضرت مرزا طاہر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الرّابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز

انتساب

پیارے سرور کونین محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم، آپؐ کے حضور یہ ناچیز کاوش چند اوراق کی شکل میں حاضر ہے۔ میری قوم کے جن شہداء کرام نے اپنی جانیں دے کر احیاء اسلام کیا، **میری آرزو** ہے کہ میری سعی کی یہ **بوند** بھی خدا تعالیٰ ان کی قربانیوں کے سمندر میں شامل فرما دے۔ آمین یا ربّ العالمین

سیّدہ حفیظۃ الرحمٰن
بیگم میر مبارک احمد تالپور

کیا خبر ان کو ہے کیا جام شہادت کا مزا
دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں جو سراب زندگی

رہے وفا و صداقت پہ میرا پاؤں مدام
ہو میرے سر پہ میری جان تیری چھاؤں مدام

(کلام محمود)

فہرست

سَلَامٌ قَولاً مِن ربٍّ رحیم

خدائے رحیم کی طرف سے تم پر سلامتی ہے
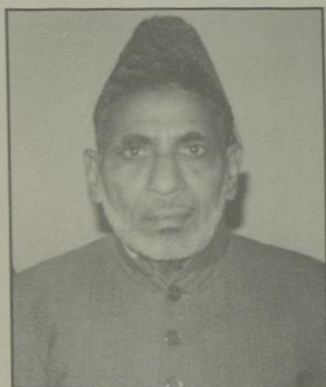
صاحبزادہ مرزا غلام قادر احمد صاحب

ڈاکٹر عبدالقدوس صاحب
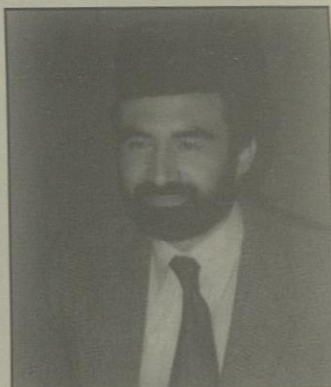
ملک اعجاز صاحب
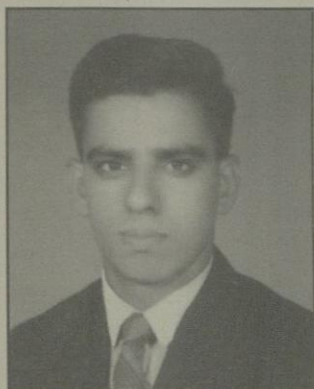
ایوب اعظم صاحب

وسیم احمد بٹ صاحب
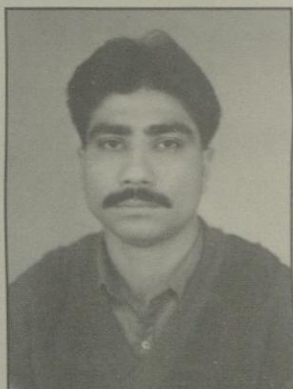
حفیظ احمد بٹ صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسول کریم

پیش لفظ

ساتھیو میرے ساتھ ساتھ رہو
قربتوں کا لئے پیام چلو

نگینے لوگ حصہ دوئم قارئین کرام کی خدمت میں پیش ہے۔شہداء کرام جن کا ذکر اس کتاب میں کر سکی ہوں، ان کے لواحقین کی میں شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنے شہیدِ محترم کے رات دن کا لائحہ عمل مجھے لکھ کر بھیجا ہے۔ان کی قربانی کو زندہ رکھنے میں لواحقین کا بڑا دخل ہے۔کیونکہ وقت کی رفتار تیزی سے شواہد و واقعات کو پیچھے چھوڑ جاتی ہے اور صرف ایک نقش حافظہ میں محفوظ رہ جاتا ہے جو آہستہ آہستہ دھندلا سا جاتا ہے، کیونکہ وقت ایک مرہم ہے،

ہاں مگر

کسی شہید کی اخلاقی عظمت کو اجاگر کرنے سے کئی مقاصد حاصل ہو جاتے ہیں۔مثلاً شہید کی اخلاقی اقدار کا نمونہ آنے والی نسل کے لئے ایک روشنی کا مینار بن کر سامنے آ جاتا ہے۔دوسرے قوم کو یقینِ محکم ہو جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے افضال کو جذب کرنے کے لئے اعمالِ صالحہ ضروری ہیں۔لہٰذا وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی پر نظر رکھتے ہیں اور پھر وہ علامتِ عباد الرحمٰن جو شہدأ کرام کی شب و روز میں نمایاں تھیں، احیاء اسلام کا موجب ہو جاتی ہیں، یعنی وہ خود بھی زندہ ہیں اور زندگی بخش بھی ہیں۔چنانچہ میری کوشش یہی رہی ہے کہ اسلامی

اقدار کا فلسفہ مرتب کر کے شہداء کرام کو ان اقدار کا آئینہ دار ثابت کروں تا آنکہ میرے لوگ اعلیٰ اخلاق اور پختہ ایمان کے نور سے مزّین ہو کر ابرار و اخیار کی صف میں کھڑے ہو سکیں۔ آمین

چونکہ میری کتاب کا موضوع ہی **نگینے لوگ** ہے، اس لئے میری کوشش یہی رہی ہے کہ شہداء کرام کو قوی الایمان ثابت کروں تا کہ آنے والے لوگ وہی راستے متعین کریں اور بخوبی جان لیں کہ قربانی دینے والے لوگ پیروی اور اطاعت کے کس معیار پر تھے۔ وہ اچانک راتوں رات شہداء کی صف میں شامل نہیں ہوئے بلکہ ان کے اعمال صالحہ متقاضی تھے کہ وہ انعام یافتہ گروہ میں شامل کئے جائیں، سو خدا نے انہیں چُن لیا اور ایک دن منصبِ شہادت پر لے گیا۔ خدا تعالیٰ خود آگے بڑھا اور تھام کر اپنے رفیقوں کے زمرے میں شامل کر لیا۔ الحمد للہ علی ذالک۔

ثم الحمد اللہ کہ خدا تعالیٰ نے مجھے توفیق عطا کی کہ میں نے ان کی بزرگی کو اجاگر کرنے کی سعی کی اور انہیں زندہ اور زندگی بخش ثابت کرنے کے لئے ان کے واقعات کو ضبطِ تحریر میں لا کر اپنی قوم کے لوگوں کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کر کے دعا کی درخواست کی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، رحمتیں نازل کرتا چلا جائے اور رضائے باری تعالیٰ ہمارا مقدر ہو جائے۔ آمین ثم آمین۔

کلید فتح و ظفر تھمائی تمہیں خدا نے اب آسمان پر
نشانِ فتح و ظفر ہے لکھا گیا تمہارے ہی نام کہنا

(کلامِ طاہر)

سیّدہ حفیظۃ الرحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ ونصلی علی رسول کریم

انعامِ شہادت

شہادت کا بدلہ خدا خود ہے

شہدائے احمدیت وہ نگینے لوگ ہیں جنہوں نے اپنے سر تبرؔ کے نیچے رکھ کر قوم کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ بیشک انہوں نے راہ حق میں جان کی قربانی دے کر اسلام یعنی **خدا کے دین** پر ایک بہت بڑا احسان کیا ہے مگر خدا تعالیٰ کسی کا احسان نہیں رکھتا، اس کا اجر بہترین رنگ میں عطا کر دیتا ہے۔ یاد رہے کہ شہداء وہی خوش قسمت لوگ ہیں جن کے متعلق سرورِ کونین محمد مصطفیٰ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہداء کو پانچ کرامات کی صورت میں خصوصی اعزاز بخشا ہے۔

۱۔ تمام نبیوں کی ارواح کو ملک الموت نے قبض کیا مگر شہداء کی روحیں اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور اپنی منشاء مبارک کے مطابق خود قبض کرتا ہے۔
۲۔ جملہ انبیاء کو موت کے بعد غسل دیا گیا مگر شہید نہلائے نہیں جاتے۔
۳۔ سارے نبیوں کو کفن پہنایا گیا لیکن شہداء کو انہی کے کپڑوں میں دفن کیا جاتا ہے۔
۴۔ انبیاء فوت ہو گئے اور انہیں اموات کہا گیا مگر شہید کو مردہ نہیں کہا جاتا۔
۵۔ نبیوں کو قیامت کے دن حق شفاعت عطا ہو گا مگر شہید ہر روز جن کی نسبت چاہیں، شفا کرتے ہیں۔[۱]

---

[۱] تفسیر الجامع الاحکام القران، جلد چہارم، صفحہ ۲۷۶

تو یہ ہیں وہ پانچ کراماتِ خصوصی جن کا وعدہ خدا تعالیٰ نے اپنی راہ میں قربان ہونے والے شہداء کرام سے فرمایا ہے۔ بے شک شہادت کا بدلہ خدا تعالیٰ خود ہے اور دنیا و آخرت میں اس سے بڑھ کر کیا انعام و اکرام ہوگا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے کیا خوبصورت فرمایا ہے:

یہ راہ تنگ ہے، پہ یہی ایک راہ ہے
دلبر کی مرنے والوں پر ہر دم نگاہ ہے

پس اے شہداء کرام! آپ کو صد مبارک ہو کہ اس راہ تنگ سے گزر کر آپ نبوت کے قدموں میں جا گزیں ہوئے اور نقش و نمونہ دے کر سخاوت کے باب کھول گئے۔ اپنے خون سے اس دھرتی کو زرخیز کیا اور اس جنت الفردوس کے حقیقی وارث بن گئے جس کے دروازے پر ملائک استقبال کے لئے کھڑے ہیں اور شہداء کرام قادرِ مطلق کی نگاہِ کرم کے مرکز ہیں۔ الحمد للّٰہ ثم الحمد للّٰہ۔

جب تازہ کوئی زخم ملا راہِ وفا میں
ہم جھکے گئے سجدہ میں وہیں شکر کے مارے
صد شکر کہ تو نے ہمیں توفیق عطا کی
صدقے تیرے اسلام کے جانوں سے اتارے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

نگینے لوگ کو ضبطِ تحریر میں لانے کے دو اہم مقاصد میرے مدِ نظر ہیں:

اول، ان لوگوں کو جنہوں نے احمدیت یعنی حقیقی اسلام کے نام پر اپنی زندگیاں قربان کیں اور خدا تعالیٰ کا دامن تھامنے کے لئے سر سوغات میں پیش کر دیئے، انہیں تا قیامت **زندہ** رہنے کا حق ہے۔ اور یہ حق اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کیا ہے تاہم ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ان کے ذکر واذکار کو اپنی مجلسوں میں زندہ رکھیں۔ تا وہ ہر احمدی گھرانے کا ایک مثالی فرد بن جاویں لہٰذا ضروری ہے کہ ان کو ہر جہت سے ضبطِ تحریر میں لایا جائے۔

دوسرے آئندہ آنے والی نسل میں روشنی منتقل کرنا بھی اصل مقصد ہے۔ اگر ہم اپنے قربانی کرنے والے اسلاف کو اپنی نسلوں کے لئے ماڈل بنائیں گے، یعنی ان کی تقلید کریں گے تو یقیناً کل کے آنے والے لوگ اپنے ایمان میں پختہ ہو کر حق الیقین کے درجے تک پہنچ جائیں گے کیونکہ وہ علم الیقین سے آشنا ہونے کے باوجود ماحول سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں،

مگر

شہداء کرام کی علامات عباد الرحمن، عبادات، ریاضیات، اخلاقیات اور سب سے بڑھ کر الٰہی احسانات وانعامات جب اُن پر عیاں ہوتے ہیں تو عین الیقین کے درجے تک اُنہیں رسائی ہو جاتی ہے۔ اور بالآخر حق الیقین کا معراج انہیں نصیب

ہو جاتا ہے اور یہی تحریر کا ماحصل ہے اور یہی میرے لوگوں کی عظیم کامیابی ہے۔الحمد للہ۔اور آج اس عظیم کامیابی کے ساتھ بہت سے خوش قسمت ہمیں ملیں گے۔انشاء اللہ

	آیئے ملتے ہیں اپنے انعام یافتہ لوگوں سے	سن شہادت
۱۔	محترم ڈاکٹر عبدالقدوس صاحب	۱۹۸۹ء
۲۔	محترم ملک محمد دین صاحب	۱۹۹۱ء
۳۔	محترم وسیم احمد بٹ صاحب	۱۹۹۴ء
۴۔	محترم حفیظ احمد بٹ صاحب	۱۹۹۴ء
۵۔	محترم میاں محمد صادق صاحب	۱۹۹۶ء
۶۔	محترم ماسٹر نذیر احمد بگھیو	۱۹۹۸ء
۷۔	محترم ملک اعجاز احمد صاحب	۱۹۹۸ء
۸۔	محترم محمد ایوب اعظم صاحب	۱۹۹۸ء
۹۔	محترم صاحبزادہ غلام قادر احمد صاحب	۱۹۹۹ء
۱۰۔	میاں محمد اشرف شہید	---

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شہادت کا نمونہ

حضرت مسیح موعود علیہ السلام، بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ نے اپنی ایک عظیم تصنیف، براہین احمدیہ کے صفحہ ۵۱۱ پر ایک پیشگوئی تحریر فرمائی ہے جس میں

شاتان تُذبحان

کا جملہ نمایاں ہے اور یہاں یہی زیرِ غور ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”اگرچہ میں تجھے بچاؤں گا مگر تیری جماعت میں سے دو بکریاں ذبح کی جائیں گی اور ہر ایک جو زمین پر ہے، فنا ہو گا“۔ شاتان سے مراد بکریاں ہے، یعنی بے گناہ اور معصوم ہونے کی حالت میں قتل کی جائیں گی۔ خدا تعالیٰ نے اس جگہ انسان کا لفظ چھوڑ کر بکری کا لفظ استعمال کیا کیونکہ بکری میں دو ہنر ہیں، وہ دودھ بھی دیتی ہے اور پھر اس کا گوشت بھی کھایا جاتا ہے۔۔۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام امامِ زماں مزید فرماتے ہیں کہ ”چونکہ صاحبزادہ مولوی عبداللطیف صاحب کو ان دو صفتوں کی وجہ سے بکری سے بہت مشابہت تھی اور میاں عبدالرحمٰن بھی بکری سے مشابہت رکھتا تھا، اس لئے ان کو بکری کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

پھر حضور فرماتے ہیں:

یہ دونوں بکری کی صفتیں مولوی عبداللطیف صاحب مرحوم کی شہادت سے پوری ہوئیں کیونکہ مولوی صاحب نے مباحثہ کے وقت انواع و اقسام کے معارف اور حقائق بیان کر کے لوگوں یعنی مخالفوں کو دودھ دیا۔ گو بدقسمت مخالفتوں نے وہ دودھ نہ پیا اور پھینک دیا۔ اور پھر شہید مرحوم نے انہی جان کی

قربانی سے اپنا گوشت دیا اور خون بہایا تا مخالف اس گوشت کو کھاویں اور اُس خون کو پیویں۔۔۔ ''کیا ممکن ہے کہ جب تک انسان آنکھ بھر کر خدا کو نہ دیکھے، وہ ایسی قربانی دے سکے۔ بے شک ایسا خون اور گوشت ہمیشہ حق کے طالبوں کو اپنی طرف دعوت کرتا رہے گا جب تک کہ دنیا ختم نہ ہو جائے۔''[1]

پس قارئین کرام، آج سو سال بعد بھی ہم لافانی اور لاثانی نمونہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اور اپنے اردگرد دین متین کی راہ پہ قربان ہونے والے وجود ہمیں وہ راہیں دکھاتے ہیں جن پر چل کر وہ اُن بکریوں کے مثیل کہلا سکتے ہیں جن میں دونوں صفات موجود تھیں۔ انہوں نے اپنے دین کی اشاعت و تبلیغ کے لئے آرام و سکون وقف کر دیا اور حقائق و معارف پیش کئے لیکن بدنصیب مخالفوں نے انہیں ردّ کیا اور پھر انہوں نے جان تک کی قربانی دی جو کسی زر اور زمین کے لئے نہیں تھی بلکہ صرف اور صرف اپنے دین کے لئے انہوں نے اپنا گوشت دیا اور خون دیا۔۔۔۔۔۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اُس **نمونۂ شہادت** کو قیامت تک زندہ رکھا جائے اور اُس کو زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ تاریخ کے اوراق بھی ان حالات اور قربانی سے مزّین ہوں۔ یاد رہے کہ خون دینے والا خون دے کر قربانی کرتا ہے اور اس طرح قوم کی رگوں میں نئی زندگی پیدا کرتا ہے۔ اگرچہ وہ خود بھی ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جاتا ہے بموجب کلام الٰہی۔۔۔ لیکن

اُس کے ذکر کو قائم رہنا اسی حالت میں ہوا کرتا ہے کہ وہ پیغام رسانی کی شکل میں آئندہ آنے والی نسلوں تک پہنچے اور ان کی رگوں کو گرما دے۔ چنانچہ شہادت کے ساتھ ساتھ اُن کی قربانیوں کا مستند ذکر و اذکار بھی قیامت تک انہیں قائم رکھے گا۔ انشاء اللہ اور ہماری آنے والی نسلوں کے لئے شہادت کا یہ سفر نمونہ بن کر

---

[1] تذکرۃ الشہادتین، صفحہ ۷۱

سامنے آئے گا کیونکہ جماعت ہمیشہ نمونہ کی محتاج ہوتی ہے۔

ہماری خاکِ پا کو عدُو کیا خاک پائے گا
ہمیں رکنا نہیں آتا اُسے چلنا نہ آتا ہے
اُسے رُک رُک کے بھی تسکین جسم و جان نہیں ملتی
ہمیں مثلِ صبا چلتے ہوئے ستانا آتا ہے　کلام طاہر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم

ھوالناصر، خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

صاحبزادہ مرزا غلام قادر احمدؒ شہید

کوچۂ جاناں میں مر جانا بھی ہے تسکینِ جاں
یہ شہادت تو خدا کی دین ہے جانِ تپاں

حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضرت امامہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اللہ کو دو قطروں سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہیں۔ ایک وہ آنسو جو اللہ کی خشیت سے گرا ہو اور دوسرا وہ قطرۂ خون جو راہِ مولیٰ میں بہایا گیا ہو۔'' (جامع ترمذی)

چونکہ خدا تعالیٰ کو ان دو قطروں سے محبت ہے، اس لئے یہی دو قطرے یعنی حضرت امامِ زماں مہدئ موعود علیہ السلام کے پوتےؒ کی آنکھ سے بہنے والا آنسو اور اسی بابرکت وجود کے پڑپوتے کا قطرہ خون جو راہِ مولیٰ میں بہایا گیا ہے، سب کو محبوب تر ہیں۔ جو طبائع میں ایسا ہیجان پیدا کر گئے ہیں کہ ہر آنکھ آنسو بہاتی ہے اور ہر قطرۂ خون راہ تلاش کر رہا ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ وہ شخص ایک تراشیدہ ہیرا تھا، قوم کا ایک **نگینہ** تھا جس کو جدھر سے بھی اور جس جہت سے بھی دیکھیں، ایک انوکھی چمک دکھائی دیتی تھی۔ اس نُور و چمک کو لفظوں میں بیان کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اگرچہ ہر دوسرا آدمی کسی نہ کسی رنگ میں ان کو

محبوب رکھتا ہے اور ان کے اخلاق کو اعلیٰ نمونے سے بیان کر کے اپنی محبت کے رنگ سے اسے سجاتا بھی ہے تاہم میں نے بھی اپنی بساط کے مطابق کوشش کی ہے کہ اُس دلنواز انسان کے اخلاقِ حمیدہ کے درِمکنون سے ان اوراق کو مزمزین کر لوں جس نے میری قوم کو سجایا ہے، تو آیئے ملتے ہیں خاندانِ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے روشن چراغ اور ہمیشہ اول آنے والے قادر شہید سے۔

پیدائش: حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی دعاؤں کا وارث

قمر الانبیاء حضرت مرزا بشیر احمدؓ کے فرزند صاحبزادہ مرزا مجید احمدؒ صاحب اور حضرت سیدہ امتہ الحفیظ بیگم صاحبہ کی دختر مبارک قدسیہ بیگم صاحبہ کو اپریل ۱۹۵۱ء میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ایک مبارک بندھن میں باندھ دیا۔ یہ مبارک جوڑا یعنی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا پوتا اور نواسی خدا تعالیٰ کے عظیم فضلوں کو سمیٹتے ہوئے پاکستان کے مختلف شہروں میں رہائش پذیر رہے۔ اور پھر ایک موقع پر افریقہ میں بھی مقیم تھے کہ خدا تعالیٰ نے انہیں ایک اور نعمت کی نوید عطا کی جبکہ ان کے گھر ایک بیٹا اور دو بیٹیاں موجود تھیں۔ چونکہ ماں ہمیشہ آنے والے بچے کے لئے بڑی خوشکن امید رکھتی ہے اس لئے محترمہ صاحبزادی قدسیہ بیگم صاحبہ بھی پردیس میں دعاؤں کی وادی میں ہی تقویت محسوس کرتی رہیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ ”میں نے اپنی اولاد کے لئے بہت دعائیں کی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ ۱۶/۱۵ سال کی عمر میں بہت کم لڑکیاں ہوں گی جو دنیاوی آسائشوں، راحتوں کی بجائے نیک نسل مانگتی ہوں۔“

اور وہ اکثر انتہائی تڑپ سے یہ دعا کیا کرتی تھیں کہ:

”خدایا مجھے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی دعاؤں کی وارث اولاد عطا کر“

کیونکہ

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا ایک الہام تھا:

''غلام قادر آئے، گھر نور اور برکت سے بھر گیا''

لہٰذا یہ الہام ان کے مدنظر تھا، اس لئے وہ ہمیشہ دعائیں بھی کرتی تھیں اور خواہش بھی کرتی تھیں کہ ''غلام قادر خدا تعالیٰ ان کو عطا کرے۔ وہ تحریر کرتی ہیں کہ پتہ نہیں کتنے سال سے اس کا انتظار تھا کہ غلام قادر آئے۔ کب سے یہ نام دل میں چھپایا ہوا تھا کہ کہیں یہ نام کوئی اور نہ رکھ لے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے اپنے فضلوں سے صاحبزادی قدسیہ بیگم کی دعاؤں کو قبولیت عطا کی اور غلام قادر، جن کا انتظار تھا، آ گئے، گھر نور اور برکتوں سے بھر گیا۔''

دعاؤں کے جواب میں ۲۱ فروری ۱۹۶۲ء، جمعہ اور ہفتہ کی درمیانی شب بمقام لاہور خدا تعالیٰ نے صاحبزادی کو ایک بیٹا عطا فرمایا جس کا نام غلام قادر تجویز کیا گیا۔ بے شک ڈاکٹر سمیع کے کلینک پر تین بجے رات پیدا ہونے والا بچہ ایک عجیب غیر معمولی شان والا تھا جس کے متعلق حضرت میرزا بشیر احمدؓ صاحب بھی فرماتے تھے کہ اس بچے کے ماتھے پر **شان** ہے۔ اس خوبصورت شاندار ماتھے والے بچے کو اس کے دادا جان حضرت قمر الانبیاء یعنی ٹھنڈی چھاؤں والے قمر نے نے کان میں اذان دی اور دعا کی

چنانچہ

حضرت مسیح دوراں مہدی علیہ السلام کی دعاؤں کا وارث **غلام قادر** اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ بھرپور انداز میں پروان چڑھتا رہا۔ عام بچوں کی نسبت زیادہ لمبا عرصہ تک توتلی زبان میں باتیں کرتا رہا۔ لیکن ذہین و فطین طبیعت کا مالک تھا اس لئے شوخی و شرارت بھی ایسی کہ جس سے سب لطف اٹھائیں نہ کہ کوفت ہو۔ کیونکہ ذہین بچے شرارتیں کیا کرتے ہیں لیکن نہایت خوشکن ہوتی ہیں۔ ہاں، بچپن میں سنجیدگی سے پڑھائی کی طرف توجہ نہیں تھی مگر تربیت کا معراج خوب میسر آیا کیونکہ خدا تعالیٰ نے انہیں ایسے لوگوں کی گود عطا کی تھی جن کا ماحول ہی **رنگ و**

نــور بانٹنے والا تھا۔اس لئے جیسے جیسے قادر کی عمر بڑھتی گئی، ان میں ایک نمایاں تبدیلی آنے لگی۔ان کی ایک خاص مسکراہٹ تو آخر دم تک رہی لیکن سنجیدگی اور کم گوئی میں اضافہ ہونے لگا، پڑھائی کی طرف توجہ بڑھتی گئی اور۔۔ پھر ایک دن پتہ چلا کہ قادر پورے پشاور میں اول آئے ہیں۔ایبٹ آباد اسکول میں پڑھنے والا خادم ایک عظیم نوجوان بن کر سامنے آیا۔روحانی حسن کے ساتھ ساتھ خدا تعالیٰ نے انہیں جسمانی حسن بھی وافر دیا ہوا تھا۔

آپ کا شاندار تعلیمی ریکارڈ ہمیں نوید دیتا ہے کہ اگر اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ جذبۂ Nobility ہو تو سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے۔اگرچہ اعلیٰ تعلیم تو اکثر لوگ حاصل کرتے ہیں مگر کلچر اور ماحول سے ان کے عادات و اطوار کی ایسی کھچڑی بن جاتی ہے کہ وہ اپنی ذات میں Non Plus ہو جاتے ہیں مگر صاحبزادہ شہید کی اعلیٰ تعلیم صرف اور صرف وقف کے تحت حاصل کی گئی تھی۔اس لئے جب بھی **مقدس جذبہ** موجزن ہو تو انسان ہر عظمت کو فضلِ ربی کہہ کر گلے لگا لیتا ہے۔الحمدللہ کہ پنجاب یونیورسٹی سے الیکٹریکل انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی اور پھر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے امریکہ تشریف لے گئے جہاں انہوں نے جارج مینن یونیورسٹی سے کمپیوٹر سائنس میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کر لی۔

”۲۰ سال قبل قادر نے ایبٹ آباد پبلک اسکول پشاور بورڈ میں ایف۔ ایس۔سی میں اول پوزیشن حاصل کی۔پھر یہ کامیابی اسے امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں لے گئی جہاں اس نے کمپیوٹر سائنس میں ایم۔ایس۔سی کی ڈگری حاصل کی۔شہید قادر بہت سے ڈالر کمانے کے کیریئر کو پسِ پشت ڈال کر پاکستان واپس چلا آیا۔یہاں بھی اس نے ملٹی نیشنل غیر ملکی بنکوں میں قسمت آزمانے سے انکار کر دیا جو اسے بڑی خوشی سے خوش آمدید کہنے کو تیار تھے کیونکہ وہ ذہین بھی تھا

اور ڈسپلین کا پابند بھی تھا۔''[1]

بیشک، بیشک، وہ ذہین اور ڈسپلن کے پابند تھے کیونکہ تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کے پہلو کو مدِ نظر رکھا گیا ہوا تھا۔ دراصل یہ خادم بنیادی طور پر اس خاندان کا چشم و چراغ تھا جو دنیا میں رنگ و بُو بانٹنے کے لئے ہی آیا ہوا ہے۔ اس لئے ہر مقام اس کا تربیت گاہ تھا اور ہر لمحہ ان کا لمحۂ تفکر ہوتا تھا۔ انہوں نے آنکھ ہی ایسے ماحول میں کھولی تھی جو صیقل شدہ تھا، نورانی تھا، علم و عرفاں سے مالا مال تھا۔ ایسے ماحول میں انسان خدا کے فضل سے منور ہو ہی جاتا ہے اور اپنی جھولی بھر لیتا ہے مگر اپنی اپنی بساط کے مطابق۔۔۔ اور جب کسی کے متعلق خداوندِ عالم کا ارشاد ہی آ جائے کہ ''**غلام قادر آئے۔ گھر نور اور برکت سے بھر گیا۔**''[2] تو گنجائش نہیں رہتی کہ میرے جیسا کم علم آدمی کچھ تبصرہ کرے اور وضاحت کرے کیونکہ یہ خدا کے منہ کی بات ہے کہ گھر نُور اور برکت سے بھر گیا۔

یہی اس گھر کا مقدر تھا کہ شیریں ثمرات سے بھر جاتا۔ پھر جب قادر کو خدا تعالیٰ نے نوازتے ہوئے ہمیش کی زندگی عطا کی تو بھی نُور اور برکتیں اس خاندان کا مقدر ہو گئیں۔ کیونکہ وہ انعاماتِ اربعہ جس کا وعدہ خداوند عالم نے اپنے پیاروں کے ساتھ کیا ہوا ہے، قادر کے وجود سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ خاندان کو شہادت کا مرتبہ بھی مرزا غلام قادر احمدؐ صاحب شہید کی قربانی سے ہی حاصل ہو گیا۔ بیشک حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کا ۲۵ نومبر ۱۹۰۴ء کا الہام لفظ بلفظ پورا ہو گیا۔ الحمد للہ اور اس طرح یہ مبارک وجود جہاں خاندانِ مسیح موعود علیہ السلام کے لئے برکتوں کا موجب ہوا، یعنی کہ نبوت + شہادت + صدیقیت + صالحیت کے تمام جامع انعامات اس مبارک خاندان میں جمع ہو گئے، وہاں شہید محترم کا

---

[1] محترم کنور ادریس صاحب (Dawn,21-4-1999)

[2] الہام حضرت مسیح موعود علیہ السلام، نومبر ۱۹۰۴

وجود حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کے ایک الہام کو تقریباً سو سال بعد پورا کرنے کا موجب ہوا۔ الحمدللہ۔ وہ تصدیق کرنے والا محبوب وجود جب اپنے رفیق اعلیٰ کے حضور میں حاضر ہوا تو قوم کے حساس ترین طبقہ کی گواہی ان کے ساتھ تھی کہ:

ماں باپ کا جہاں میں وہ نام کر گیا
ان کی جبین پہ چاند سجاتا ہوا گیا
میں ہوں غلام قادر مطلق اسی کا ہوں
ہر حال میں یہ عہد نبھاتا ہوا گیا

(صاحبزادی امتہ القدوس)

یہ خدا تعالیٰ کے عجیب رنگ ہیں کہ دادا حضور کا لگایا ہوا پھل پوتا بلکہ پڑپوتا ۱۹۹۹ء اپریل میں حاصل کر رہا ہے۔ یہ صداقت کی مہر ثبت کرنے والا اپنی قربانی کس شان سے پیش کرتا ہے کہ شجاعت و فراست کا یہ نمونہ صحابہ کرام میں ہی صرف نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے حضرت امام جماعت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ بنصرالعزیز بے ساختہ فرماتے ہیں کہ:

"میرے دور کے شہیدوں میں مرزا غلام قادر کی شہادت کی استثنائی شان ہے، جس میں کوئی اور شامل نہیں۔"

استثنائی شان یہی تو ہے کہ مسیح دوراں مہدی موعود علیہ السلام کی صداقت پر اپنی قربانی کے لہو سے مہرِ صداقت لگا دی اور دنیا کو روز روشن کی طرح اس الہام کو سچا کر دکھایا کہ غلام قادر احمدؑ کے آنے سے گھر برکت سے بھر گیا۔ سبحان اللہ

حقوق اللہ اور حقوق العباد: دونوں نوعیت کے حقوق اپنی اپنی جگہ ایک اہم مقام رکھتے ہیں کیونکہ **وصال الٰہی حاجت اعظم ہے** اس لئے دونوں قسم کے حقوق تفرع + دعا + کوشش اور فضلِ ربی سے ہر انسان حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کرنے والا جب تک مخلوق کے

حقوق ادا نہ کرے گا، خدا کے حقوق کما حقہ ادا کرنے والا نہیں کہلا سکتا۔ یادرہے جہاں تک نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کا تعلق ہے، یہ تو انسان کی پیدائش کی غرض و غایت ہے لیکن خلق اللہ کے لئے نفع رساں وجود ہونے کا جہاں تک تعلق ہے تو یہ خلق خدا تعالیٰ کی محبت کے حصول کا بہترین وصف ہے اور شہید غلام قادر احمدؒ کو خدا تعالیٰ نے اس وصف سے غیر معمولی طور پر نوازا ہوا تھا۔ وہ کتنے باوفا، باصفا اور نفع رساں وجود تھے۔

آیئے ان سے پیار کرنے والوں سے سنتے ہیں۔ مثلاً محترم ڈاکٹر مرزا خالد تسلیم احمد تحریر فرماتے ہیں کہ ”ربوہ آنے کے بعد جماعت کے لئے انتھک محنت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے والدین کی ایسی خدمت کی کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ کہاں ایک الیکٹریکل انجینئر اور کہاں زمینداری لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے والد کی زمین اس طرح سنبھال لی جیسے کوئی ماہر زمیندار سنبھالتا ہے اور اپنے والد کو اس طرف سے مکمل اطمینان دیا اور جس وقت یہ اغواء ہوئے، اس وقت بھی یہ اپنے والد صاحب کی زمینوں پر کام کروا رہے تھے یعنی اس وقت بھی اپنے والدین کی خدمت میں مصروف تھے، اپنے بیوی بچوں کو بھی پورا وقت دیتے تھے۔“

اپنی ہمسفر کو بڑی چھوٹی عمر میں
اک معتبر وجود بناتا ہوا گیا

محترم ابن عادل ربوہ سے لکھتے ہیں۔ ”جلسہ سالانہ قادیان ۱۹۹۱ء جو کہ صد سالہ جلسہ تھا، کے مبارک موقعہ پر نہ صرف اس میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہوئی بلکہ خاکسار کو میاں صاحب کے ساتھ ڈیوٹی دینے کا موقعہ بھی میسر آیا۔ ہماری ڈیوٹی مہمان خانہ مستورات میں تھی۔ ایک رات کو ایک خاتون دیر سے مہمان خانہ میں پہنچی جبکہ رجسٹریشن و دیگر انتظامات کرنے والے کارکن واپس جا چکے تھے۔ لہٰذا اس وجہ سے اس خاتون کو کسی بھی کمرہ میں جگہ نہ مل

سکی اور وہ باہر برآمدہ میں پڑی رہی۔

میاں صاحب (غلام قادر احمدؒ) کو معلوم ہوا تو فوراً تشریف لائے کیونکہ متعلقہ کارکنان کے حاضر نہ ہونے کی وجہ سے مناسب جگہ کا بندوبست تو نہ ہوسکتا تھا لیکن دوسری طرف رات بھی بہت سرد تھی اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میاں صاحب نے اردگرد سے تمام بنچ اور فرنیچر وغیرہ اٹھوا کر ان خاتون کے گرد لگوا دیا کہ ان کو ٹھنڈی ہوا نہ لگے اور یہی نہیں بعدازاں آپ نے اپنا اوورکوٹ بھی اتار کر دے دیا تاکہ اسے اوپر اوڑھ کر سردی سے بچا جاسکے۔ مجھے یاد آیا کہ آپ کے عظیم پڑدادا حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بھی جلسہ سالانہ کے مہمانوں کے لئے اپنا بستر اور رضائی دے دی تھی اور ساری رات بغلوں میں ہاتھ دے کر گزاری تھی۔" [1]

محترم سید میر محمود احمدؒ صاحب ناصر، پرنسپل جامعہ احمدیہ نے فرمایا کہ عزیزم غلام قادر کو خاموشی کے ساتھ محنت اور دیانت داری سے کام کرنے کی عادت تھی۔ میں نے کبھی ان کو اونچی آواز سے بات کرتے نہیں سنا۔ خاموشی کے ساتھ محنت کرتے تھے، کسی الجھن اور جھگڑے وغیرہ میں نہیں پڑتے تھے۔ اپنے مفوضہ فرائض کے علاوہ ذیلی تنظیموں میں مسلسل خدمت کے لئے وقت دیتے تھے۔ ایک خوبی ان میں یہ نظر آتی تھی کہ وہ بہت صاف ستھرے رہتے تھے۔ یہی تو کسی شخصیت کا معراج ہے کہ صاف ستھرے کپڑوں میں صاف ستھری ذہنیت و طبیعت بھی موجود ہو اور جو خدا تعالیٰ کے فضلوں سے بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کے پڑپوتے کو وافر نصیب ہو چکی تھی۔ الحمد للہ۔

"کمپیوٹر سب کے لئے": سب سے آخر لیکن سب سے زیادہ اہم خدمتِ خلق اور نافع الناس ہونے کا ثبوت میدانِ کمپیوٹر ہے۔ جس میدان میں وسیع

---

[1] الفضل ۱۰ مئی ۱۹۹۹ء

خدمات بجالا کر وہ عظمت حاصل کی کہ آپ کا نام اس صدقہ جاریہ کی وجہ سے تا قیامت زندہ رہے گا۔ آپ ۱۹۸۹ء میں کمپیوٹر کی اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کے بعد فوراً ربوہ تشریف لائے اور مرکزِ سلسلہ میں خدمتِ دین کے لئے پیش کر دیا۔ اور تحریکِ جدید کے تحت جماعتِ احمدیہ میں پہلی بار شعبہ کمپیوٹر قائم کیا۔ اس طرح آپ جماعتی نظام میں کمپیوٹر نظام کے بانی، مبانی اور معمارِ اول ہیں۔ یہ سنہری باب آپ کی شہادت کے بعد بھی آپ کے نام پر کھلا رہے گا۔ اور آنے والی نسلیں ہمیشہ مثمر الثمرات ہوتی رہیں گی۔ ربوہ کے لوگوں کے لئے ایسی نفع مند کمپیوٹر ایسوسی ایشن وجود میں آئی کہ وقفِ نو کے بچوں کا کٹھن کام منظم طور پر مکمل کر لیا گیا۔ الحمد للہ

میاں قادر صاحب نے ۳۲۰۰ واقفینِ نو کا کمپیوٹر کا ڈیٹا تیار کیا۔ ان کی ایک خاص کامیابی ربوہ سے محبت ہے جس کا ذکر آپ کی خدماتِ ربوہ سے نمایاں طور پر نظر آتا ہے کہ ہر میدان علم و عمل میں میاں قادر صاحب نے ربوہ کو شہر علم و عرفاں ثابت کر دیا۔ محبتِ ربوہ کا ایک اور واقعہ سید محمود احمد شاہ صاحب لکھتے ہیں، پڑھئے دلچسپ ہے:

"قادر کرکٹ کا شوقین بھی تھا۔ جب امریکہ سے واپس آیا تھا۔ ان دنوں ہمارے ربوہ میں رہنے والے رشتہ دار اور لاہور میں رہنے والے رشتہ داروں کے درمیان کرکٹ میچ ہو رہا تھا۔ قادر کو اس کے ایک کزن نے کہا کہ تم لاہور کی طرف سے کھیلو۔ اس پر قادر نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں ربوہ کی طرف سے ہی کھیلوں گا۔ ربوہ کے خلاف ہرگز نہیں کھیلوں گا۔ یہ قادر کی اپنے شہر ربوہ سے محبت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔"

شمولیتِ وقف: وقف اصل میں عملی زندگی کا ہی دوسرا نام ہے اور علم کے ساتھ عمل لازم و ملزوم ہوا کرتا ہے۔ میاں قادر اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ گئے اور جانے

سے پہلے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ امریکہ میں ابھی آپ کی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی کہ آپ نے حضور کی خدمت میں لکھا۔ ''حضور کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں نے زندگی وقف کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کی اجازت لی تھی۔ انشاء اللہ اگست ۱۹۸۹ء میں میری تعلیم M.S.Computer Science مکمل ہو جائے گی، اس کے بعد حضور جہاں مناسب سمجھیں، مجھے کام پر لگا دیں۔''

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے جذبۂ وقف کی بہت تعریف کی اور فرمایا ''یہ کوائف ان کی ذہنی اور علمی عظمت کو ہمیشہ خراجِ تحسین پیش کرتے رہیں گے۔ اصل تعلیم تو ان کی واقفِ زندگی ہونے کی ہے۔''[1]

صاحبزادہ قادر شہید نے ثابت کر دیا کہ بیشک وقف اصل میں عملی زندگی کا ہی دوسرا نام ہے۔ ''وہ نوجوانوں کو تربیت دینے کے لئے ایک چھوٹے سے قصبے میں چلا گیا جو اس کی جائے شہادت سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ اتنا ہی کماتا تھا جو زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے۔ اس نے سوچا کہ اس نے اپنے کم وسائل کے اس قصبے کا قرض ادا کرنا ہے جہاں وہ پیدا ہوا تھا''۔[2]

۱۹۸۹ء سے لے کر ۱۹۹۹ء تک ربوہ میں انہوں نے جو عملی خدمات سر انجام دیں، وہ انہیں ہمیشہ کے لئے کمپیوٹر کے ہر میدان میں زندہ رکھیں گی۔ آپ نے یہ جدید علم جماعت کی خدمت کے لئے نہایت محنت عرق ریزی اور فنی مہارت سے استعمال کرنا شروع کیا۔ اور مختلف شعبہ جات کے کمپیوٹر کے پروگرام تیار کیے۔ ان میں وصیت، وقفِ نو، امور عامہ، دعوت الی اللہ، مال اول، امانت تحریک کے شعبے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ فضلِ عمر ہسپتال کے کچھ حصوں کا کام بھی آپ نے اعزازی طور پر کیا۔

---

[1] الفضل ۷ امئی ۱۹۹۹ء

[2] کنوار ادریس، ڈان ۲۱ اپریل ۱۹۹۹ء

محترمہ ڈاکٹر نصرت جہاں بحوالہ فضل عمر ہسپتال لکھتی ہیں کہ مرزا غلام قادر صاحب سے میرا تعلق تقریباً دو سال پرانا ہے۔ میں نے ان کے ساتھ بہت سا وقت گزارا اور ان سے بہت کچھ سیکھا۔ ہمارے شعبہ میں جتنا بھی کام انہوں نے کیا، وہ ایک صدقہ جاریہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کمپیوٹر کے افتتاح سے لے کر اس کی پراسسنگ، ٹیچنگ اور Running میں ہر لمحہ وہ ہمارے ساتھ رہے۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انہوں نے انگلی پکڑ کر سب کچھ سکھایا۔

خون کی حرمت کو پہچانا: ان تمام پیاروں کے تاثرات کے بعد ضروری ہے کہ آپ کے والدِ محترم صاجزادہ مرزا مجید احمدؐ صاحب کے صبر و ثبات والے جذبات کا تذکرہ بھی ہو جاوے۔ فرماتے ہیں۔ ''حضرت بانیٔ سلسلہ کی نسل سے جہاں اولوالعزم خلفاء پیدا ہوئے، جن میں سے ایک کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''نور آتا ہے نُور۔'' وہاں ایک ٹھنڈی چھاؤں والا قمر بھی تھا۔ یہ لوگ اولیاء اللہ ہیں۔ اور اے غلام قادر، تو نے راہِ حق میں اپنا خون بہا کر ان میں ایک راہِ مولیٰ میں قربانی دینے والے کا بھی اضافہ کر دیا۔ جب تک تو زندہ رہا، تو نے اس خون کی حرمت کو پہچانا اور اس کی حفاظت کی اور آخر میں اُسی کی راہ میں اسے بہا کر اس کا حق ادا کر دیا۔ تجھ پر تیرے پڑدادا اور تیرے دادا خوش ہوئے۔ تو نے خلیفۂ وقت سے تحسین کے کلمے سنے اور اپنے کمزور والدین کے لئے باعثِ افتخار بنا۔ تجھ پر ہزاروں سلام ہوں اور اللہ تعالیٰ تجھ پر اپنی نعمتیں فرماتا چلا جائے۔ آمین۔

وہ وجود بیشک ایک مطمئن نفس کا مالک تھا: آپ جب بھی ملیں گے، وہ آپ کو محبت کا مجسمہ بن کر ملیں گے کیونکہ وہ اپنے ساتھیوں کا، ماتحتوں کا بہت خیال رکھتے تھے اور اگر کسی کو کوئی شکایت ہوتی تو جس حد تک ممکن ہوتا، شکایت کنندہ کو مطمئن کر کے متعلقہ کارکن یا فرد کی پردہ پوشی فرماتے۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو افسر نہیں بلکہ دوست خیال کرتے تھے۔

پس صبر و وفا کا پیکر اور محبت کا مجسمہ، ذکی نفس اور مطمئن طبیعت کا مالک صاجزادہ قادر شہید نونہالان جماعت کے لئے تا قیامت مشعلِ راہ بن گیا اور ایسے روح فرسا سانحہ پر قابلِ صد احترام صبر وہمت کی عظیم مثال صاجزادی بی بی قدسیہ بیگم نے ہمیں عطا کی ہے۔ بیشک یہ وہی گود ہے جس نے نور بانٹا اور غم کی ان گھڑیوں کو ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے لئے ایک مشعل بنا دیا اور ثابت کر دیا کہ صبر وضبط کی تعلیم وتربیت دینے والا مبارک وجود یہی ہے جو "سچے احمدی کی ماں کہلاتا ہے۔"

محترم صاجزادہ مرزا مجید احمد صاحب، قادر شہید کے والدِ محترم فرماتے ہیں کہ میری بیوی نے قادر کی قربانی پر جس طرح صبر وضبط کا مظاہرہ کیا اور قادر کو رخصت کیا، وہ ازحد قابلِ تحسین ہے۔ آفرین ہے ایسی ماں پر جس نے اپنے لختِ جگر کو آخری بار رخصت کرتے ہوئے بار بار پکار کر کہا۔ قادر جزاک اللہ، قادر جزاک اللہ۔ مائیں ماتم کرتی ہیں اور کون سی ماں ایسی ہوگی جس کے صبر کے بندھن ایسے حالات میں ٹوٹ ٹوٹ نہ جاتے ہوں، لیکن دھن ہے ایسی ماں پر جو اپنے نورِ نظر کی نعش اٹھتے وقت اس کا شکریہ ادا کر رہی ہے۔

کیونکہ صاجزادہ قادر شہید نے اپنے خون کو پہچانا اور اس کا حق ادا کر دیا اور بیشک وہ شکریے کے ہی مستحق ہیں کیونکہ وہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اولاد میں سے پہلے فدائی ہیں جنہوں نے راہِ حق میں قربانی دے کر شہداء کرام کی صف میں عظیم مقام بنا لیا اور خاندان کو شہادت کا فخر اور عظمت وبلندی عطا کی،

کیونکہ

"اسلام کا درخت قربانی کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا۔"[1] اور چونکہ لقاء الٰہی ایک نہایت ہی قیمتی چیز ہے اور دنیا میں قیمتی چیزوں کے متعلق یہ دستور ہے کہ ان کی

---

1 خطبات محمود، حصہ دوم، صفحہ ۱۹۴

حفاظت کا زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے۔پس یاد رہے کہ لقاءِ الٰہی کو محفوظ رکھنے کا ذریعہ اولاد کی قربانی ہے۔

اور

اولاد کی قربانی دو طرح کی ہوتی ہے۔ظاہری رنگ میں تو اس طرح کہ اولاد کی اعلیٰ تربیت کی جائے۔ان میں دین کی محبت اور اس سے رغبت پیدا کی جائے اور انہیں علمِ دین سے واقف کیا جائے۔مگر اس کے علاوہ اولاد کی ایک خاص قربانی بھی ہوتی ہے۔اور وہ یہ کہ انسان اپنی اولاد کو اللہ تعالیٰ کے دین کے لئے وقف کر دے تاکہ جب تک وہ زندہ رہے، اسلام کی خدمت کرتی رہے۔[1] قربانی کے یہ دونوں رنگ خدا تعالیٰ کے فضل سے اس خاندان صاحبزادہ مرزا مجید احمدؒ صاحب اور صاحبزادی بیگم قدسیہ بی بی صاحبہ میں پائے جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی خاص عنایت ہے کہ یہ رنگ صاحبزادہ مرزا غلام قادر احمدؒ شہید پر چوکھا چڑھ گیا ہوا تھا۔یہ رنگ جذبۂ قربانی جب پختہ ہوا تو انہوں نے بخوشی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی سی قربانی پیش کر دی اور اس طرح مرزا غلام قادر شہید نے اسلام کو احیاء یعنی زندگی کا پانی مہیا کیا۔اور اپنی حرمتِ خوں کو پہچانا اور اس کا حق خوب ادا کیا۔جزاک اللہ قادر، جزاکم اللہ قادر، جزاک اللہ۔

"مولیٰ کی آج تم پر پڑی نظرِ انتخاب
تم ہی چُنے گئے ہو بصد عز و شانِ خاص
مولیٰ کرے کہ ہم میں سے ہر اک کو نصیب
تیری ادائے منفرد تیری زبانِ خاص

(مکرم مرزا نبیل احمدؐ صاحب)

اے صاحبزادہ قادر شہید!! خدا تعالیٰ نے انعام شہادت عطا کر کے آپ

---

[1] خطباتِ محمود، صفحہ ۲۵۲

کونواز لیا۔ جب کہ آپ پہلے ہی اپنے ماں باپ اور بیوی بچوں اور امامِ وقت حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کے دلنواز تھے۔ اب آپ اپنے مولیٰ کریم کے بھی دلنواز بن گئے۔ بیشک آپ اپنی محبتوں اور وفا میں یکتا تھے۔ اسی لئے تو وصالِ الٰہی آپ کا مدعا ٹھہرا۔ پس خاندانِ مہدی موعود کو مبارک ہو کہ قادر شہید کے **رتبۂ شہادت** پانے سے چاروں انعام الٰہی آپ کے لئے تکمیل کو پہنچے۔ الحمد للّٰہ علی ذالک۔

امیر محمود احمد صاحب ناصر فرماتے ہیں:

وہ ہمارا بھی تھا اور تمہارا بھی تھا
میرے پیارے کی آنکھوں کا تارا بھی تھا
بہت عاجزی تھی، بہت سادگی تھی
محبت کا دل میں شرارا بھی تھا

میرے پیارے کی آنکھوں کا تارا بھی تھا: بہت خوب فرمایا ہے اور نقطۂ مرکزیہ ہے بھی یہی کہ جس کا ذکر خود امامِ وقت حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرالعزیز نے فرمایا ہے کہ "**میرے دور کے شہداء میں مرزا غلام قادر کی شہادت کو استثنائی مقام حاصل ہے۔**" اس استثنائی شان کی وضاحت تو میں نہیں کر سکتی، البتہ حضور پرنور کی دردانگیز کیفیت کو سامنے رکھ کر اُن محبت بھرے جذبات کا ذکر واضح کرتا ہے کہ بیشک یہ امتیازی نشان والا وجود تھا۔ "وہ نہایت محنتی، خاموش طبع اور دلنواز شخصیت کے مالک تھے۔" یہ خراجِ تحسین ایک محبوب آقا اپنے بے لوث خادم کی قربانی پر فرما رہے ہیں۔ بیشک وہ مہر وفا کا نشان خدائی بشارتوں کے ماتحت اپنے وقت پر آیا اور اپنی تکمیلِ عمر میں عظیم کاموں کی بنیاد ڈال کر عظیم الشان سرخروئی کے ساتھ اپنے آقا کے پاس واپس چلا

گیا۔اپنے کردار، اپنی شخصیت، اپنی خدمات اور شجاعت کے ایسے انمٹ نقوش چھوڑ گیا کہ نونہالانِ جماعت کے لئے تا قیامت مشعلِ راہ ہوں گے۔وہ جدید دنیوی علوم کا ماہر خدا اور اس کے دین کی چوکھٹ پر سب کچھ نثار کر گیا۔وہ اپنے خون سے دشمنوں کو ذک پہنچا گیا کہ چشمِ دجل حیراں ہے اور دعویٰ دارانِ وفا و محبت کی آنکھ جب بھی اس کی قربانی پر نظر کرے گی، خیرہ ہوگی۔مبارک وہ وجود جس کی صلب سے یہ گوہرِ گراں مایہ منسوب تھا، مبارک وہ قوم جس کا یہ سپوت تھا اور مبارک وہ روحیں جو اس کی عظمت کو پانے کی کوشش کریں گی، مبارک وہ آہیں اور آنسو کہ انتہائے صبر و رضا، تشکر و امتنان، محبت اور فطری غم جن کی ترکیب ہوئی، مبارک وہ سوگواران جو حسنِ صبر کی عظیم مثالیں قائم کر رہے ہیں۔[1]

ماں: پیدائش سے پہلے اور پیدائش کے بعد ماں کا مربیانہ وجود بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہوا کرتا ہے۔یہی وہ مقدس ہستی ہے جو بچے کو تقویٰ کی راہوں پر موڑ کر صالحیت کے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے۔قرآن کریم اور آنحضرت ﷺ نے عورت کو عظیم الشان مقام عطا کیا ہے۔اور اسی لئے تو عورت کو محاورہ میں کہتے ہیں کہ:

''ماں کے لحاظ سے دیکھتے ہوئے پگڑی گر جاتی ہے''[2]

اور آج

محترم صاحبزادہ غلام قادر شہید کی ماں بھی عظمت کے اس بلند مقام پر کھڑی ہیں جہاں انہیں دیکھنے والے کی پگڑی گر جاتی ہے۔محترم شہید کی بہترین زندگی، بہترین قربانی اور بہترین پائندگی، سب ماں کی دعاؤں کی بدولت ہے۔اگر شہیدوں کی موت سے قوم کو زندگی ملتی ہے تو اس شہادت سے قوم نے واقعی نئی زندگی پائی ہے کیونکہ اس نے اپنی جان کا نذرانہ دے کر ہزاروں معصوموں کو

---

[1] الفضل ۳ جولائی ۱۹۹۹ء (ایک تعزیتی قرارداد)

[2] خطاب جلسہ سالانہ ۱۹۸۸ء

درندگی اور بہیمیت سے بچالیا۔اس عظیم قربانی کے لئے خدا نے اس مقدس روح کو چن لیا جو حضرت مسیح موعود کی جسمانی اولاد بھی ہے اور روحانی اولاد بھی۔[1]

قارئین!اس غلام قادر کے لئے جس کا انتظار تھا،ان کی عظیم ماں کی مستند گواہی ہمیں یقین کے اعلیٰ درجہ پر لے جاتی ہے کہ بیشک ان خصوصیات کا مالک ہی ہمیشہ مبشر خوابوں کا انعام ہوا کرتا ہے۔وہ لکھتی ہیں اپنے قادر کے لئے کہ:

''قادر بہت خاموش طبیعت کا تھا۔فضول باتیں یا گپ شپ کی عادت نہ تھی۔سنتا سب کی تھا۔مگر یونہی پیچھے نہیں لگ جاتا تھا۔کرتا وہی تھا جو مناسب سمجھتا تھا۔ بے حد تابع تھا۔تکلفات سے بہت دور تھا۔میں سمجھتی ہوں کہ وہ پیدا ہی وقف کے لئے ہوا تھا۔دنیا وحرص یا اعلیٰ چیزوں کی خواہش نہیں تھی۔اپنے Means میں رہ کر خرچ کرتا تھا۔یہ نہیں کہ اس کو اچھی چیز کی پہچان نہیں تھی مگر اپنے حالات سے بڑھ کر خرچ کرنا مناسب نہ سمجھتا تھا۔

کنجوس بالکل نہ تھا۔مگر فضول خرچی کو پیسے کے ضیاع کو پسند نہیں کرتا تھا۔ میرے بچوں کا بے حد خیال کرتا تھا اور محبت کرنے والا تھا۔ماں باپ کا فرمانبردار اور گہرا خیال رکھنے والا تھا۔کھانا پلیٹ میں بہت کم ڈالتا تھا اور ختم کر کے اور لیتا تھا۔حرص سے زیادہ ڈالنے کی عادت نہیں تھی۔تھوڑا تھوڑا اور آہستہ آہستہ کھاتا تھا۔خود کم ہی کھاتا تھا مگر کم کھانے کی مقدار کھانے کی میز پر کم پسند نہیں کرتا تھا،کھلا کھلا اور کافی پکا ہو،خواہ کم کھائے۔ایک ترتیب اور سلیقہ مندی سے کام کرتا تھا۔جیسے زمینداری اس کا دلچسپی کا کام نہ تھا نہ اس کا شعبہ تھا۔مگر کام سنبھالا تو پرانے زمینداروں اور تجربہ کاروں سے زیادہ اچھا سنبھالا۔اسی طرح جماعت کا جو بھی کام سنبھالا،اس کو بہت سلیقے سے کیا۔

---

[1] الفضل ۱۹ اپریل

کسی سے مقابلہ نہ تھا، کسی سے رشک و حسد نہ تھا۔ اس نے اپنے لئے ایک راستہ متعین کر لیا تھا۔ کم عمری میں ہی اور ادھر ادھر دیکھے بغیر اس پر گامزن تھا اور وہ راستہ خدا کی رضا کا راستہ تھا۔

بے حد دیانت دار تھا، کوئی طبیعت میں چکر نہیں تھا۔ راست گو، راست باز بندہ تھا۔ کاش خدا اسے مہلت دیتا۔۔۔"

تو یہ تھی گواہی ایک صبر ررضا کی پیکر ماں کی جس کے مربیانہ ہاتھ نے انہیں چشمۂ معرفت سے پانی پلایا تھا، اسی لئے آج قادر شہید کی رخصت کے وقت خدا کی مرضی پر برضا رہتے ہوئے فخرِ دیار بیٹے کی ماں محترمہ صاحبزادی قدسیہ بیگم فرماتی ہیں۔ "میرا پیارا قادر، میرا فخرِ دیار بیٹا، میری دعاؤں کا ثمر جو کچا توڑا گیا لیکن پکے ہوئے ثمر سے زیادہ شیریں نکلا۔ میری حالت اس وقت ایسی نہیں کہ میں کچھ زیادہ لکھ سکوں۔۔۔۔ وہ ماں باپ کا بہترین خدمت گزار تھا، اطاعت گزار تھا۔۔۔ وہ بہترین خادمِ دین تھا، میرے بیٹے کا ایک ایک منٹ دین کی اور ماں باپ کی خدمت میں گزرا، اگر کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ وہ اپنے بچوں کو خاطر خواہ وقت نہ دے سکتا تھا۔ اس کا طریقہ اس نے یہ سوچا کہ ایک وقت میں دو کام ہو جائیں۔ وہ اکثر اپنے بچوں کو زمین پر اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ زمین کی نگرانی بھی ہو جاتی اور بچے اپنے باپ کی قربت بھی پا لیتے۔"

ازدواجی زندگی: خیر کم خیر کم لاھلہ کہتے ہوئے جب ہم اعلیٰ اخلاق کے پیکر مرزا غلام قادر کے اہل و عیال سے ملتے ہیں تو ہمیں بے حد خوشی ہوتی ہے کہ رَبُّ البیت مجسمہ حسن و اخلاق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضلوں کو جذب کرنے والا وجود حضرت مصلح موعود خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی نواسی صاحبزادی امۃ الناصر نصرت صاحبہ ہیں۔ یہاں گھر کے در و دیوار ٹھنڈے اور گھنے سایہ کی نشاندہی کرتے ہیں۔

۲۳ جنوری ۱۹۸۶ء کا مبارک دن خدا تعالیٰ کے فضلوں سے دونوں

خاندانوں کے لئے رحمتوں کا موجب تھا۔ جب امام وقت حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے اپنے مبارک سائے تلے اپنی بھانجی محترمہ امۃ الناصر صاحبہ کو صاحبزادہ غلام قادر کے ساتھ رشتۂ ازواج میں باندھ دیا تھا۔ آپ نے دعاؤں سے اپنے دلنواز قادر کو ایسا عظیم الشان تحفہ دیا جو تعلیم و تعلم میں بہت گراں قدر تھا۔ پس محترم مکرم میر داؤد احمد مرحوم اور صاحبزادی امۃ الباسط صاحبہ کے مربیانہ ماحول میں شب و روز گزارنے والا وجود قادر شہید کی زندگی میں مکمل ۱۳ سال محبت و قربانی کا نمونہ پیش کرتا رہا جو ہمیشہ کے لئے انمٹ نشان چھوڑ گیا اور ان تیرہ سالوں میں خدا تعالیٰ نے اس خاندان کو چار خوبصورت ننھے منے ثمرات سے نوازا جن کے خوبصورت دلربا نام محبت و شفقت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مثلاً بڑی بیٹی صالحہ سطوت صاحبہ ہیں، بڑا بیٹا مرزا کرشن احمد ہیں۔ اور دو جڑواں بھائی (۱) مرزا نورالدین احمد صاحب (۲) مرزا محمد مفلح صاحب ہیں۔ خدا تعالیٰ انہیں اپنے فضلوں سے سلامت رکھے کہ اپنے ابا جان کی طرح مثالی زندگی عطا کرے اور وہ خاندان کے لئے دائمی خوشی کا موجب ہوں۔ آمین۔

محترم قادر شہید کے بچوں کے لئے دعا کرتے ہوئے ان کی دادی جان کہتی ہیں ''خدا کا سایہ کبھی ان کے سر سے نہ اٹھے، خدا ہر آن ان کا نگہبان ہو، خدا میرے بیٹے کی خدمتوں کا صلہ اس کی اولاد کو دے۔ وہ ۳۷ سال جیا، مگر ایک واقعہ یاد نہیں کہ اس نے نافرمانی کی ہو یا کوئی حرکت اس کی ناگوار گزری ہو۔ وہ خوشیاں دیتا رہا جب تک زندہ رہا۔ وہ مر کر بھی ہمارا سر بلند کر گیا۔ وہ جیا بھی شان سے اور وہ مرا بھی شان سے اور دائمی خوشی دے گیا۔ میری درخواست ہے کہ اس کی بیوی بچوں کے لئے دعا کریں، وہ خادمِ دین ہوں۔ حضرت مسیح موعود کی دعاؤں کے وارث ہوں کہ یہی ہماری ابتداء ہے اور یہی ہماری انتہاء۔ میرے بچے زندہ باد، زندہ باد۔

کاشانہ درثمین: خدا تعالیٰ کے فضل و احسان اور خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ کی دعاؤں کے طفیل امتہ الناصر نصرت صاحبہ بیگم قادر شہید کے صحن گلشن میں ان خوبصورت خوشنما پھولوں سے خوب رونق ہے جو قادر شہید اپنے بچوں کی صورت میں انہیں دے گئے ہیں۔ کوئی پھول سطوت کی خو صبر و رضا کی تصویر بن کر چمن قادر کو رونق بخش رہا ہے تو کوئی پھول نورالدین کی سی محبت میں مسجودِ بیت الذکر ہے اور کہیں کرشن احمد اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کر کے امی کے غم کو اپنے آنسوؤں سے ٹھنڈا کر رہا ہے پاس ہی دوسرا پھول مفلح قادر اپنے پیارے بابا کی تصویر سے سوال و جواب کرتا ہے اور اس گلشن کا مالی اپنے پھولوں کی محبت و نگہداشت میں صبح کرتا ہے شام کرتا ہے اور دعاؤں کی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ کبھی کبھی چونک کر وہ پوچھتا بھی ہے کہ ”کیا واقعی قادر چلا گیا ہے لیکن وہ گیا کہاں ہے؟ وہ تو ہمارے پاس ہی ہے ہمارے گھر میں ہے۔ کبھی کرشن کی شکل میں اور کبھی سطوت کی صورت میں اور کبھی مفلح اور نورالدین کی سی ادائیں سمیٹے گھومتا پھرتا ہے۔ اور یہی محترمہ امتہ الناصر نصرت صاحبہ کے کاشانہ درثمین کی رونق ہے۔ جو ان کے گھر کو روشن کیے رکھتی ہے۔ وہ تحریر کرتی ہیں کہ:

”قادر کے بعد میں سوچتی ہوں کہ ہم کیسے کہہ دیتے ہیں کہ زندگی اور موت کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ موت سے دور کوئی چیز نہیں۔ شروع میں جب زخم کچا تھا تو سب تسلی دیتے تھے کہ وقت کے ساتھ انشاء اللہ صبر آ جائے گا۔ زخم بھی کچھ بھر جائے گا۔ سب ٹھیک بھی کہتے تھے اور غلط بھی۔ بظاہر زخم بھر گیا لیکن کبھی لگتا ہے کہ نہیں یہ گھاؤ تو بہت گہرا ہے۔ یہ راہ تو بہت کٹھن ہے قدم قدم پر اس کی یاد مجھے روکتی ہے۔ ہر لمحہ اس کا خیال میرے ساتھ ہے عجیب متضاد کیفیات میں وقت گزر رہا ہے۔“ ۔۔۔۔

مگر نہیں ! نہیں!

ان کے حوصلے کو بلند تر کرنے والا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا ایک شعر وہ بار بار پڑھتی ہیں

حیلے سب جاتے رہے اک حضرتِ تواب ہے

بے شک خدا تعالیٰ نے ان کے بچوں کو ایسا باپ دیا تھا جو اپنے بچوں کو ایک روشنی دکھا گیا۔ ہمیشہ سچ پر قائم رہنے والی روشنی۔ میں بچوں کو بھی سمجھاتی ہوں کہ تمہارے باپ نے سچ کی خاطر اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کی۔۔۔تم سب بھی ہمیشہ سچائی پر قائم رہنا۔

مختصر مگر شاندار: بیگم صاحبزادہ قادر شہید فرماتی ہیں کہ زندگی میں کوئی شخصیت ایسی ہوتی ہے جس پر آپ کو مان ہوتا ہے۔ میری زندگی میں یہ شخصیت قادر کی تھی۔ اس کی شہادت کے ساتھ میری زندگی کا ایک موسم ختم ہوا۔ اس کا عرصہ بہت مختصر مگر شاندار تھا۔ ہم اپنی ہی چھوٹی سی دنیا میں مگن تھے۔ ہماری دلچسپیاں ہمارے شوق ایک تھے۔ اس کے ساتھ بیتا ہوا وقت یادگار رہے میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا۔ کئی مواقع ایسے آتے جب کسی خاص بات پر اس کا رد عمل دیکھ کر میں موازنہ کرتی تھی۔ کہ یہی بات میرے ساتھ ہوتی تو کیا میرا رد عمل بھی یہی ہوتا جو قادر کا تھا تو جواب ہمیشہ نفی کی صورت میں ملا۔ اتنی گہری نیکی مجھ میں نہیں ہے۔

ناشکری سے بچانا: خدا تعالیٰ کے حضور میں دعائے عاجزانہ پیش کرتے ہوئے اور مولیٰ کریم کے احسانات کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہوں کہ وہ ایسا ساتھی تو نہیں تھا کہ جسے بھلایا جاسکے۔ اس کی کمی وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی جائے گی لیکن ہر گزرے دن کے ساتھ اپنے پیارے ربّ کے احسانات اس کا غم حد سے بڑھنے سے پہلے ہی ڈھارس بندھاتے ہیں۔ اے اللہ تیرے احسانات کے شکر کا حق تو کبھی ادا نہیں ہوسکتا۔ بس تو ہمیں ناشکری سے بچانا آمین۔

آدھا فرشتہ: صاحبزادہ شہید کی فاتحانہ مسکراہٹ کا ذکر کرتے ہوئے ان کی بیگم محترمہ امتہ الناصر نصرت فرماتی ہیں۔ ''قادر کی طبیعت ایسی تھی کہ اس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ بس میں اسے کہتی تھی قادر تم آدھا فرشتہ ہو اور وہ خاموشی سے مسکراتا تھا۔ بعض اوقات تو میں اس کی طرف حیرت سے دیکھتی رہ جاتی تھی کہ طبیعت میں ایسی گہری نیکی؟ ایسی سعید فطرت؟ آخری بات مجھے اس کی وہ خدمت کبھی نہیں بھول سکتی جو اس نے Twins کی پیدائش کے بعد جب میں بیمار ہو گئی تھی، اس وقت میری کی تھی۔ ساری ساری رات اگر میں کہتی تھی کہ قادر، درد بہت ہے، تم میرے پاس ہو کر بیٹھ جاؤ، تو ساری رات میرے پاس بیٹھ کر گزار دیتے تھے، دن رات ایک کر دیتے تھے۔ میرے ساتھ، مجھے یاد ہے، جس دن میری طبیعت زیادہ خراب ہوتی تھی، اس دن میں رو رہی تھی اور ساتھ ساتھ قادر بھی روتا جاتا تھا۔ میرے دل سے مسلسل اور اب تک دعائیں نکلتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر لمحہ اس کے درجات بلند کرے اور ہم سب کی طرف سے وہاں بھی ہمیشہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی رکھے۔ آمین۔ شہادت کے بعد جو دشمن کو مات دینے والی فاتحانہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر تھی، وہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔''[1]

یہ تو تھے درد میں اور صبر میں ڈوبے ہوئے وہ تاثرات جو بیگم صاحبہ نے بیان فرمائے ہیں جن کی روشنی سے یہی نقشہ سامنے آیا ہے کہ بیشک وہ دلکش شخصیت تھے۔ جو دنیائے احمدیت کو سوگوار کر گئی اور انکسار ایسا تھا کہ بالکل بے تکلف اظہار تھا۔ گھر میں بے تکلفی سے رہتے تھے۔ بچوں سے بے حد پیار کرنے والے بابا جان تھے۔ بے تکلف کھیل کود ان سے کرتے تھے۔ کبھی وہ فٹ بال ٹیم کے کیپٹن بھی تھے اور سائیکلنگ کا بھی شوق تھا۔ ایک دفعہ سائیکل پر لاہور سے پنڈی بھی گئے تھے۔ پس صاحبزادہ قادر شہید محترم دنیوی وسعتوں کو پھلانگ کر اور

[1] الفضل ۵ مئی ۱۹۹۹ء

بلندیوں کو چھو کر شہادت کا عظیم مقام پا گئے۔ الحمد للہ۔

تھا جنازہ میں ہجوم عاشقاں
بے پناہ مخلوق تھی دیدار پر

اور یہی مخلوقِ خدا گواہیاں دے رہی تھی کہ یہ ایک عظیم خاندان کا ایک عظیم چشم و چراغ تھا اور یہ خدا کے محبوب بندے کی آنکھوں کا تارا تھا۔

قارئین کرام! آپ جانتے ہیں کہ ایمان لانے کے بعد بندگانِ خدا سے محبت سب سے بڑی نیکی ہے اور قادر شہید کی زندگی کو ہر زاویہ سے پرکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ خدا کی مخلوق سے محبت کرنے والا نیکی کی معراج پر تھا اور ان کی زندگی کا ہر لمحہ خوشنودیٔ مولیٰ کی طلب میں گزرتا تھا اور خدا کا دامن تھامنے کے لئے ہر خطرہ کو بخوشی قبول کیا اور بالآخر ایک دن ۱۴ اپریل ۱۹۹۹ء وہ مُبارک ساعت آگئی کہ تا قیامت سلامتی کا پیغام آپ کو آن ملا۔ اور ایک محبوب وجود کا فرمان قادر شہید نے حرف بحرف پورا کر دیا جو کبھی اس مبارک وجود نے فرمایا تھا کہ

جیو تو کامران جیو، شہید ہو تو اس طرح
کہ دین کو تمہارے بعد عمرِ جاوداں ملے

۱۴ اپریل ۱۹۹۹ء، آخری کام: مصاحبزادہ شہید کا منتہائے نظر صرف یہی تھا کہ کام اور صرف کام۔ وہ خود بھی کام کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ ہر وہ شخص جو ان کے دائیں بائیں آگے پیچھے نظر آئے، اس عظیم جذبہ کو جذب کر لے اور اسے وہ قوت مل جائے جس سے قوم تعمیری واخلاقی ترقی کی طرف گامزن ہو اور یہی مومن کی شان ہے کہ وہ خود روشن ہوتا ہے اور دوسرے کو بھی روشنی پہنچاتا ہے۔ بیشک وہ سچے مومن تھے اور مومن ہمیشہ فعال زندگی پر راضی ہوتا ہے لہٰذا جب وہ اپنے خالقِ اعلیٰ سے ملے تو کام پر ہی جا رہے تھے اور یہ ایک احساسِ ذمہ

داری کا لمحہ تھا کہ والدین کی خدمت کے طور پر جب زمینوں پر جاتے تو اپنے بچوں کو وقت دینے کی غرض سے ساتھ لے جاتے۔ آج وہ تنہا تھے کہ خدا تعالیٰ کے فرشتوں نے انہیں دائمی زندگی کا سلام پیش کیا اور چنیدہ لوگوں میں شمولیت کی نوید سنائی۔

صاحبزادہ غلام قادر احمدؒ کو چن لیا: اور جب خدا تعالیٰ اپنے بندے کو چُن لیتا ہے تو وہ بے نیاز ہوتا ہے، اسے یہ پرواہ نہیں ہوتی کہ اس کا بندہ دائیں پہلو پر گرا ہے یا بائیں پہلو پر جان جانِ آفریں کے سپرد کر رہا ہے یا کس ہتھیار سے نبرد آزما ہوا ہے اور کس رخ پر سنگسار کیا جا رہا ہے۔ اس کے حضور میں تو جان کی بازی لگانے والا ہی **ہر اول دستے میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ ایسے وجود ہیں کہ جن پر نظر پڑتی ہے خدا کی رحمت کی تو باقی لوگ بھی بخشے جاتے ہیں۔**"

مرثیہ کہیے، قصیدہ یا غزل
کچھ بھی لکھ دیجئے سر اشعار پر
یہ عقیدت اور محبت کے ہیں پھول
ٹانکتا ہوں میں تری دستار پر

راجہ نذیر احمد صاحب بڑے درد سے محبت اور عقیدت کے پھول دستار پر رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے عظیم قادر شہید، میں مرثیہ کہوں یا قصیدہ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ

جان دی تو نے خدا کے پیار پر

قتل کیوں؟ قادر کو کیوں قتل کیا گیا؟ یہ سوال ہے جو کنور ادریس صاحب نے اخبا اخبار ڈان میں ۱۲۹ اپریل ۱۹۹۹ء کو کیا ہے۔ پھر خود ہی جواب دیتے ہیں کہ "یہ بات کبھی معلوم نہ ہو سکے گی کیونکہ اسے اغواء کرنے والے چند گھنٹوں کے بعد ایک

پولیس مقابلہ میں مارے گئے، جن کی صداقت ان کی تعداد بڑھنے کے ساتھ گھٹتی جا رہی ہے۔ یہ پولیس مقابلہ جس طرح بیان کیا جا رہا ہے، اس پر ہم میں سے کوئی بھی یقین نہیں کرسکتا ہے۔''

قارئین! آپ کو یاد ہوگا کہ یہ واقعہ قتل چنیوٹ میں دریائے چناب کے پل کے پاس پیش آیا۔ لہٰذا چند گھنٹوں کے بعد پولیس نے حملہ آوروں کا پیچھا کیا اور انہیں چنیوٹ کے ایک اسکول میں گھیر لیا جہاں قاتلوں نے طلباء کو انسانی ڈھال کے طور پر پکڑ لیا اور پھر ہوا کیا؟ کہ پولیس کی فائرنگ سے چاروں حملہ آور مارے گئے جبکہ وہ تمام طلباء جو ڈھال کے طور پر استعمال ہوئے تھے یا پولیس والے، کوئی زخمی نہیں ہوا۔ یہ بات عقل میں نہیں آسکتی کہ ان کو گھیرنے کے باوجود کوئی بھی آخر زندہ کیوں نہیں پکڑا گیا؟ ان کی گرفتاری عمل میں کیوں نہیں آئی؟ آخر قتل کے محرکات اور شواہد کو کیوں تباہ کیا گیا؟ اس کا جواب صرف وقت دے گا اور میں صرف یہ کہوں گی کہ ظالم جب ظلم کرتا ہے وہ کیوں، کیا، کس لئے، پر غور نہیں کرتا بلکہ ظلم اس کی سرشت میں پڑا ہوتا ہے اور جہاں ایک تیر سے دو شکار ہوسکیں، ظالم کے لئے سنہری موقع ہوتا ہے، لیکن ہم نے تو آنکھیں کھولتے ہی یہ سبق سیکھا تھا کہ

ظالم کو ظلم کی برچھی سے تم سینہ و دل برمانے دو
یہ درد رہے گا بن کے دوا تم صبر کرو وقت آنے دو

چونکہ وصالِ الٰہی حاجتِ اعظم تھی اور قضا و قدر میں دائمی زندگی مقدر تھی۔ چنانچہ وقت آگیا اور خدا خود آگے بڑھا اور شہداء کے ذمرے میں شامل فرما دیا۔ جبکہ وہ دلنواز وجود اپنی ذمہ داری وقت پر پوری کرنے جا رہے تھے۔

امتیازی نشان: یہ خدا تعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ صاحبزادہ شہید کو ایک امتیازی شان حاصل ہے اور یہاں اس کا ذکر کرنا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ امر واقع

یہ ہے کہ **نگینے لوگ** حصہ اول اور حصہ دوم میں جن شہداء کرام کا میں نے ذکر کیا ہے، انہوں نے اپنی انفرادی قربانی پیش کی اور جماعت کو ایک نمونہ دے کر اپنے مولا کریم کے قریب تر ہو گئے۔ مگر صاحبزادہ غلام قادر کی شہادت ایک امتیازی رنگ رکھتی تھی کیونکہ انہوں نے اپنی انفرادی قربانی کے نتیجہ میں اپنے لوگوں کو اجتماعی قربانی سے نجات دلائی اور خدا تعالیٰ نے ایسے سامان پیدا کر دیئے کہ ''اس شہادت کے نتیجہ میں بکثرت معصوموں کے خون بہائے جانے کے احتمال سے خدا تعالیٰ نے بچا لیا۔ وگرنہ یہ بہت ہی گہری اور بہت ہی کمینی اور ہولناک سازش تھی۔'' دشمن نے یہ سازش یوں کی تھی کہ:

اوّل: ''محرم کا مہینہ ہے، اس لئے دنیا پر ظاہر کرنا تھا کہ سارے ملک میں یہ کہہ کر آگ لگائی تھی کہ بے چارے سپاہ صحابہ پر خوامخواہ الزام آتے ہیں، اصلی بدمعاشی جماعت احمدیہ کر رہی ہے اور محرم وغیرہ کے موقعہ پر جو ملک گیر فسادات ہوتے ہیں، ان میں یہ ذمہ دار ہیں۔ اور اگر یہ پتہ چل جائے کہ جماعت احمدیہ ملوث ہے تو پھر وہ ملک گیر فسادات بہت زیادہ ہولناک صورت اختیار کر سکتے تھے۔ بے شمار احمدی معصوموں کی جانیں ان کے رحم و کرم پر ہوتیں جو رحم و کرم کے نام تک نہیں جانتے۔

دوئم: کار سمیت ان کی لاش جلا دینا مقصود تھا۔'' چنانچہ ماہرین بڑی قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں اور ان کے پاس یہ کہنے کی وجوہات موجود ہیں۔ ان کی کار سمیت ان کی لاش کو وہ کہتے ہیں کہ جلا دینا مقصود تھا جس میں دہشت گردی کے جدید ترین ہتھیار مثلاً راکٹ لانچر، گرینیڈ اور گرینیڈ لانچر اور بہت سی کلاشنکوفیں بھر دی جاتی تھیں۔ یہ خیال کیونکر ان کو آیا اس لئے کہ ایک شخص کے قتل کے لئے اتنا بھاری اسلحہ جو دہشت گردی کے جدید ترین لوگوں کو جو ٹرینڈ آدمی ہیں، ان کو دیا جاتا ہے، وہ ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ ایک کار سے ان

سارے جدید ترین اسلحات کی بھرمار پکڑی گئی ہے اور ان ماہرین کا خیال ہے کہ یہ ساری چیزیں ان کی کار میں بھر کر اس کا جلا دینا مقصود تھا لیکن اندر سے وہ چیزیں پکڑی جاتیں اور یہ الزام لگتا کہ سارے پاکستان میں جو خطرناک اسلحہ تقسیم ہو رہا ہے اور بدمعاشیاں کی جارہی ہیں، یہ جماعت احمدیہ کروا رہی ہے۔ اور یہ جو چیزیں پکڑی گئیں یہ پولیس نے تسلیم کیا ہے کہ وہ ایک طرف تو اس کو اتفاقاً ڈکیتی کا واقعہ بیان کرتی ہے اور دوسری طرف تسلیم کرتی ہے کہ ساری چیزیں ان کے پاس تھیں۔ عام ڈکیتی میں اتنے خطرناک ہتھیاروں کی ضرورت کیسے ہوسکتی ہے، یہ ویسے ہی ناممکن ہے۔

سوئم: دبلے پتلے مرزا غلام قادر کے تیکھے نقوش اور گورے رنگ پر سیاہ داڑھی بہت جچتی تھی۔ دنیاوی وجاہت اور شاندار تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ ساتھ وقفِ زندگی نے ان کے محاسن کو دوچند کر دیا تھا۔ ہاں! احساسِ ذمہ داری بھی ان کا ایک حسن تھا، مثلاً! مکرم میاں عبدالمجید صاحب، دارلصدر غربی، ربوہ، لکھتے ہیں کہ چند سال قبل جب خاکسار دارالصدر غربی، حلقہ قمر میں بطور زعیم، انصاراللہ خدمت بجالا رہا تھا تو چندہ مجلس انصاراللہ کے سلسلے میں محترم صاحبزادہ مرزا مجید احمد صاحب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ اس قسم کے کام آپ نے اپنے فرزند یعنی صاحبزادہ مرزا غلام قادر احمدؐ صاحب کے سپرد کئے ہوتے ہیں، اس لئے ان سے رابطہ کروں۔ اسی طرح تمام زمینوں کی ذمہ دری، گھر بار کی ذمہ داری اور تمام دفاتر کے کمپیوٹر سیکشن کی ذمہ داری اور وقفِ نو کی ذمہ داری سمیٹنے والے صاحبزادہ غلام قادر کو جب آخری ذمہ داری کا سامنا ہوا تو وہ گھبرائے نہیں۔ ”شدید جسمانی اذیت پہنچی مگر بالکل پرواہ نہیں کی، آخر دم تک ان سے لڑتا رہا اور اغواء کا منصوبہ ناکام کردیا اور سڑک پر باہر نکل کر ان کی گولیوں کا نشانہ بننا قبول کرلیا۔ اس جانی قربانی کا یہ پہلو ایسا ہے جو میں سمجھتا ہوں

کہ قیامت تک اس کے خون کا ہر قطرہ آسمان احمدیت پر ستاروں کی طرح جگمگاتا رہے گا۔"[1]

قارئین کرام! تو یہ تھی امتیازی شان جو صاحبزادہ کے نصیب میں خدا نے لکھ دی تھی۔ اور آج میرے آقا کے منہ سے نکلے ہوئے مبارک الفاظ لکھتے وقت میرا قلم کانپتا ہے کیونکہ میرے آقا!! ناز اور غم کے جذبات کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:

"مجھے اس بچے سے بہت محبت تھی۔ میں اس کی خوبیوں پر گہری نظر رکھتا تھا۔ میں جانتا تھ کہ کیا چیز ہے، اس وجہ سے میں بہت ہی پیار کرتا تھا۔ گویا یہ میری آنکھوں کا تارا تھا۔ مجھے صرف ایک حسرت ہے کہ کاش کبھی لفظوں میں اس کو بتا دیتا کہ اے قادر تم مجھے کتنے پیارے ہو۔ کبھی آج تک ناز اور غم کے جذبات نے مل کر میرے دل پر ایسی یلغار نہیں کی۔ ناز بھی ہے اور غم بھی ہے۔ ان دونوں جذبات نے مل کر کبھی میرے دل پر ایسی یلغار نہیں کی جیسے قادر شہید کی جانی قربانی نے کی ہے۔ خدا کے حضور آنسو بہانا منع نہیں ہے، کوشش بھی ہونی چاہیے کہ دنیا کے سامنے یہ آنسو نہ بہیں، صرف اللہ کے حضور بہیں مگر بے اختیار نکل بھی جاتے ہیں۔۔۔"

پس اے قادر شہید، تو ہمیشہ زندہ رہے گا اور ہم سب ایک دن آ کر تجھ سے ملنے والے ہیں۔ زندہ باد غلام قادر، پائندہ باد۔

وہ للکارے گئے:

کی حفاظت قوم کی جان ہار کر
صدقے جاؤں میں تیرے ایثار پر

صاحبزادہ مرزا مجید احمد صاحب اس صبر آزما سانحہ کے تاثرات بیان

[1] الفضل، ۱۳ جولائی، ۱۹۹۹ء

کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''کسی نے سچ کہا ہے کہ انسان تو اس دنیا میں آتا ہی مرنے کے لئے ہے''۔اس سے تو کسی کو فرار نہیں۔مومن بھی مرتا ہے اور کافر بھی۔انبیاء بھی اپنی قوم کو روتا اور سکتہ کی حالت میں چھوڑ کر رفیق اعلیٰ سے جا ملتے ہیں۔دیکھنا تو یہ ہوتا ہے کہ کسی نے زندگی کیسے گزاری اور موت کو کس طرح آغوش میں لے لیا یا موت نے کس طرح اپنی آغوش میں سمیٹ لیا؟

تو اس نکتے کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ کے عزیز از جان بیٹے غلام قادر احمد کی شہادت کے واقعات پر نظر ڈالیں تو یہ بات روز روشن کی طرح سامنے آتی ہے کہ ان کو للکارا گیا تھا، جس کا جواب انہوں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیا تھا۔خدا اور اس کے دین کی پکار پر **نثار** ہو کر اسمٰعیلی قربانی پیش کی تھی۔آپ دشمن کی یلغار پر ایک کوہ گراں کی طرح ڈٹے رہے اور قوم کی حفاظت اپنے ذمے لی اور ایسے نازک وقت میں حاضر دماغی اور بیداری کی کیفیت میں یہ بہت مشکل ترین امر ہے مگر آپ ایمان میں مضبوط اور اطاعت میں کامل تھے، اس لئے کوئی للکار آپ کے پائے ثبات میں جنبش نہ پیدا کر سکی کیونکہ آپ قطعی بیداری کی کیفیت میں تھے اور دشمن تاریکی کی کیفیت میں تھا۔دونوں کی کوششوں میں نمایاں فرق تھا کیونکہ ایک نور کی طرف بڑھ رہا تھا اور دوسرا ظلمت کو گلے لگا رہا تھا جس کا نتیجہ یہی نکلا کہ **نور نے نور** کو گلے لگا لیا۔اور جرأت و استقلال کے پیکر قادر شہید نے یہ کہتے ہوئے کہ:

کشتیٔ دین محمدؐ کو ڈبو سکتا ہے کون
اس کو طوفاں سے بچانے خود خدا بھی آئے گا

جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

کیونکہ

آپ صحت مند فکر و ہوش کے مالک تھے، بہادر و بے خطر تھے لہٰذا اپنی قوم کو ایک

گہری، گھناؤنی اور گھمبیر سازش سے برمحل بچا کر اپنے خون کی حرمت کا حق ادا کر گئے جس کے لئے زبان حال سے قوم جزاک اللہ کی صدا دیتی ہے۔

باقی رہا یہ مسئلہ کہ کس طرح ان کو موت نے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا؟ تو ہمیشہ خوشیاں دینے والے قادر کے عظیم بابا جان! موت قادر پر وارد نہیں ہوئی بلکہ وہ تو زندگی کی چادر اوڑھتے ہوئے رخصت ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق جنت میں بہترین رزق حاصل کر رہے ہیں۔

آپ اگر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی المصلح موعودؓ کی تفسیر کی روشنی میں دیکھیں تو وہ مَامَاتَ کے مصداق ہیں۔ حضور فرماتے ہیں کہ مردہ اسے کہتے ہیں جو مرے اور اس کا کوئی اچھا اور نیک قائم مقائم نہ ہو۔۔۔۔ جب ہر قدم پر پہلے سے زیادہ قربانی کرنے والے لوگ موجود ہوتے ہیں تو قوم قربانی کے اس مقام پر پہنچ جاتی ہے، اسے کوئی تباہ نہیں کر سکتا۔۔۔ شہید کو ایک اعلیٰ حیات مرنے کے بعد ہی مل جاتی ہے۔ پس پہلے سلام کرنے والے قادر شہید نے جس گھڑی ابدی حیات کو سمیٹا تو بوقت قربانی ان کے کانوں میں بزبان یہ صدا آئی:

یٰاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ. اَرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ. وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ. (فجر)

"اے مطمئن روح! اپنے پروردگار کے پاس واپس لوٹ جا۔ تیرا پروردگار تجھ سے خوش اور تو اپنے پروردگار سے خوش۔ تو میرے بندوں میں شامل اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔"

<u>واقعہ شہادت:</u> ۱۴ اپریل بروز بدھ صبح کے وقت جب رحمت کے بازو

صاحبزادہ غلام قادر کے لئے پھیلے تو فرشتوں نے بڑھ کر مصافحہ کیا اور دائمی حیات عطا کر دی۔ ہوا یوں کہ صاحبزادہ قادر اپنی زمینوں پر بدھ کو جا رہے تھے کہ راستے میں جرائم کے ایک منظّم گروہ نے انہیں اغوا کر لیا۔ ''ان کا اغواء کنندہ لشکرِ جھنگوی کا ایک نہایت بدنام زمانہ مولوی تھا اور یہ چاروں مفرور مجرم پولیس کو انتہائی خطرناک جرائم کے ارتکاب میں اس درجہ مطلوب تھے کہ ان میں سے ہر ایک کے سر کی قیمت حکومت نے بیس بیس لاکھ مقرر کر رکھی تھی۔ یعنی بدبخت ملاں جو اس کا سربراہ تھا اور باقی پیشہ ور بدمعاش جو ان کی ملازمت میں رہتے ہیں، ان سب کے سروں کی بیس بیس لاکھ قیمت مقرر کر رکھی تھی'' ان کا اغوا کیا اور پھر ہر ممکن اذیتیں دیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ سارے جدید ترین اسلحات ان کی کار میں بھر کر کار سمیت ان کی لاش کا جلا دینا مقصود تھا۔

لیکن

''اب عزیزم غلام قادر شہید کا جو غیر معمولی کارنامہ ہے، وہ یہ ہے کہ اس کو سمجھ آ گئی کہ یہ ایک بہت خطرناک سازش ہے جس کے بداثرات جماعت پر مرتب ہو سکتے ہیں چنانچہ بالکل پرواہ نہیں کی کہ اس کو کیا تکلیف دی جا رہی ہے۔ اس کے گلے گھونٹنے کی کوشش کی گئی۔ اس کو ہر طرح سے اندر خنجر مار کے بھی مارنے کی کوشش کی گئی تا کہ وہ بچ کر باہر نہ نکل سکے۔ لیکن بڑی سخت جان کے ساتھ مصائب برداشت کرتے ہوئے وہ ان کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور یہ پسند کیا کہ سڑک پر ان کا خون بہہ جائے تا کہ جماعت احمدیہ اس سازش کے بداثرات سے محفوظ رہے اور ان کے قبضے میں آ کر دہشت گردی کے منصوبے میں اس کو ملوث نہ کیا جا سکے۔ یہ جدوجہد تھی قادر کی جو خدا کے فضل سے کامیاب رہی۔'' [1]

---

[1] الفضل اخبار ۱۹۰ اپریل ۱۹۹۹ء

تکفین تدفین: پس خدا تعالیٰ کی منشاء کے مطابق صاحبزادہ عبدالطیف کی روح رکھنے والا صاحبزادہ قادر شہیدان کی روحانیت کا ایک نیا پودا ۹۶ سال بعد اس عظیم درخت پر جا بسا اور تاریخ کے ماتھے کا جھومر بن گیا۔

چنانچہ اپنے محبوب خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ کی سچی اطاعت اور خدمت کرنے والے، اپنے والدین کی خدمت و فرمانبرداری کرنے والے، اپنے بیوی بچوں کی خدمت و محبت کرنے والے اور اہل ربوہ خصوصاً واقفینِ نو کی راہنمائی و خدمت کرنے والے مقدس وجود کی ۱۵ اپریل ۱۹۹۹ء کو آخری خدمت جب کی گئی تو ہر دل سوگوار اور آنکھیں اشکبار تھیں۔ ہزاروں کی تعداد میں باہر کی جماعتوں کے احباب اہلیانِ ربوہ کے دلی رنج و غم میں شریک تھے۔ پس آج ہر دل بے چین تھا اور اس بے باک قربانی پر خدا کے حضور سجدہ ریز اور دعا گو تھا کہ اے مولیٰ کریم! اس گھر کو برکتوں سے بھرنے والے **سچ کے مسافر** کا ہر قطرۂ خون بار آور ہو کر جماعت کو بڑھانے کا موجب ہو جائے۔ آمین۔ یہ دعائیں لئے سوگوار جماعت بیت المبارک میں جوق در جوق جمع ہوئی اور خاندان حضرت مسیح موعود کے پہلے شہید کی نماز جنازہ میں شرکت کی۔ محترم صاحبزادہ مرزا مسرور احمدؐ صاحب نے بعد از نماز عصر نماز جنازہ پڑھائی اور بعد ازاں دو قطاروں میں احباب نے شہید مرحوم کا آخری دیدار کیا۔ پونے گھنٹے کے لگ بھگ آخری دیدار جاری رہا۔ اس کے بعد جنازہ کندھوں پر اٹھایا گیا جس کے ساتھ لمبے بانس باندھے گئے تھے۔ جنازہ کے گرد خدام الاحمدیہ کے رضا کاروں نے ہاتھ میں ہاتھ دے کر ایک دائرہ بنا رکھا تھا۔ بیت المبارک سے جنازہ چھ بجے کے قریب روانہ ہوا۔۔ عام قبرستان میں قطعۂ شہداء کی چاردیواری میں تدفین عمل میں آئی۔ ساڑھے چھ بجے محترم صاحبزادہ مرزا سرور احمدؐ صاحب نے دعا کرائی اور ہزاروں اہل ربوہ بوجھل اور سوگوار قدموں کے

ساتھ واپس ہوئے۔

مسجود سامنے تھا لہو سے وضو کیا
ہر قطرہ اپنے خوں کا بہاتا ہوا گیا

آیئے! ہاتھ اٹھا کر دعا کریں:

''کہ میرے مولیٰ! اس گھر کو برکتوں سے بھرنے والے سچ کے مسافر کا ہر قطرہ خون بار آور ہو کر جماعت کو بڑھانے کا موجب ہو جائے۔ آمین ثم آمین۔

اِک نظر

نام:	صاحبزادہ غلام قادر احمدؒ
ولدیت:	صاحبزادہ مرزا مجید احمد صاحب ابن قمرالانبیاء حضرت مرزا بشیر احمدؓ صاحب
بیعت:	پیدائشی احمدی
عمر:	۳۷ سال، جنوری ۱۹۶۲
تعلیم:	ایم۔ایس، کمپیوٹر سائنس (جارج میسن یونیورسٹی)
شادی:	۲۳ جنوری، ۱۹۸۶ء
عہدہ اور خدمت:	ہر ممکن آسانی پیدا کی تا کہ جماعت کمپیوٹر کے نظام میں داخل ہو۔واقفین نو کو زبانیں سکھانے کے نظام کا سر خیل تھے۔ہارڈ ویئر کا کام خود بھی کرتے تھے۔ہر شعبۂ زندگی میں کمپیوٹر رائج کیا، وغیرہ۔
قرآنی تعلیم، احادیث:	قرآن پاک سے بہت لگاؤ تھا۔کچھ حصہ ابتدائی عمر میں حفظ بھی کیا تھا۔باترجمہ وتفسیر پڑھتے تھے۔
روحانی خزائن:	کتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا مطالعہ ضرور کرتے تھے۔
خدام الاحمدیہ کی خدمات:	پاکستان کی مرکزی عاملہ میں بطور مہتمم تجنید، مہتمم مال کے طور پر خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ۱۹۹۴ء سے ۱۹۹۵ء تک مہتمم مقامی ربوہ تھے۔
تاریخ شہادت:	۱۴، اپریل ۱۹۹۹ء، بوقت صبح

مقام شہادت:	چنیوٹ (چناب پل)
جنازہ:	محترم مرزا مسرور احمدؐ صاحب
تدفین:	ربوہ، قطعۂ شہداء، ساڑھے چھ بجے، ۹۹-۴-۱۵
شمائل:	بہت محنتی، خاموش طبع، بے شمار صلاحیتوں کے مالک، منکسر المزاج، دلنواز، درویش طبیعت، جذبہ خدمت سے معمور، خلیفۂ وقت کی آنکھوں کا تارا
لواحقین:	امۃ الناصر نصرت صاحبہ، ایک بیٹی، تین بیٹے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

ھوالناصر، خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

محترم ڈاکٹر عبدالقدوس شہید

کچھ خوش قسمت لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ نیک بختی کی ایک Chain ان کے خاندان میں بن جاتی ہے اور عموماً ایک تناور پھلدار درخت بھی شیریں پھل ہی دیا کرتا ہے۔ ایسا ہی گھرانہ مولوی رحیم بخش صاحب کا تھا جو خدا کے فضل سے اطاعتِ امام میں ایک ممتاز مقام رکھتا تھا۔ وہ فرمانبردار اور جانثار سرشت کے مالک تھے۔ اور ہمیشہ اخلاقی، روحانی اور دینی انقلاب لانے کے حق میں ہوتے تھے۔ ۱۸۷۷ء میں ہی تقریباً حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ملاقاتیوں میں سے تھے اور پھر خدا تعالیٰ نے ۳۱۳ صحابہ میں انہیں شمولیت کا شرف بھی عطا کیا۔ آپ بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ کے ابتدائی محبت کرنے والوں میں سے تھے۔ ایک دفعہ بٹالہ کے راستے میں مولوی صاحب کی اقتداء میں حضور نے نماز بھی ادا کی۔ [1] اور یہ اعلیٰ درجہ کی خوش نصیبی ہے جو مولوی رحیم بخش کو نصیب ہوئی۔ اور جب مولوی صاحب کی وفات ہوئی تو حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے خود نماز جنازہ پڑھایا بلکہ نماز کو کندھا بھی دیا۔ آپ کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ "**وہ ہماری مٹی سے ہے**"۔ بہت اعلیٰ درجے کی نیک بختی ہے۔

---

[1] اصحاب احمد، جلد سیزدہم، صفحہ ۱۲۲ (نمبر۲) ایضاً صفحہ ۱۶۵

قارئین کرام! مجھے مولوی رحیم بخش صاحب کے متعلق منفرد و ممتاز واقعات بتانے کی اس لئے ضرورت پیش آئی کہ میں ثابت کرسکوں کہ بزرگوں کی دعائیں نسلوں کو سنوارا کرتی ہیں۔اور متقی کی اولاد کبھی ضائع نہیں ہوتی کیونکہ تقویٰ کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں اور یہی مومن کی خوش نصیبی کی علامات ہوا کرتی ہیں۔جو ہمیں آگے چل کر ڈاکٹر عبدالقدوس شہید ابن رحیم بخش صاحب میں نظر آئیں۔

دوسرے یہ ثابت ہوا

کہ خدا تعالیٰ بندوں سے جب راضی ہوجائے تو احسانات اور انعامات کی بارش کرتا ہے۔سب سے بڑا انعام یہی ہوتا ہے کہ انسان کی نسل اپنے بزرگوں کے نقوش کو محو نہ کردے اور باپ دادا کا لگایا ہوا پودا تناور درخت میں بدل کر ثمر الثمر ات بن کر دکھائے

چنانچہ

قارئین! میرے علم میں زمین سندھ کی ایک اور حقیقت بھی محفوظ ہے،اس کا ذکر کرتی ہوں تاکہ یہ بات واضح ہوجائے کہ تقویٰ کی جڑیں بیشک گہری ہوتی ہیں۔ہمارے ایک جید صحابی پروفیسر سید عبدالقادر بھاگلپوری تھے جو ۱۹۰۳ء میں امام زماں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی محبت وصحبت میں تسکین پاتے تھے اور تعلیم وتعلم میں حد درجہ اعلیٰ مقام رکھتے تھے اور مزید برآں حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ مولوی نورالدین صاحب کا شرف شاگردی بھی حاصل تھا۔تو جب پروفیسر صاحب عملی زندگی میں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو تربیتِ اولاد کے لئے وقف کردیا کیونکہ فضل ربی کے ساتھ ساتھ صرف تعلیم وتربیت ہی اسے باقیات وصالحات بناتی ہے۔چنانچہ یہ دونوں خوش نصیب بزرگ وہ تھے کہ خوش بختی ان کی میراث ہوگئی اور خدا کے فضل سے ان کی اولاد میں منتقل ہوگئی۔

کیسے؟

وہ اس طرح انہوں نے اپنے پختہ ایمان کی بناء پر اپنی نسل کی تربیت ایسی کی کہ ان میں قربانی کا جذبہ کُوٹ کُوٹ کر بھر گیا۔ان کے دو بیٹے محترم پروفیسر عباس شہید اور ڈاکٹر عقیل بن عبدالقادر زمینِ سندھ میں صداقتِ احمدیت کے علمبردار ٹھہرے اور اپنے خون سے صداقت پر مہر لگا دی۔ان دونوں بیٹوں نے اپنا خون دے کر ثابت کر دیا کہ "تھوڑی آزمائشوں کے نتیجے میں خدا تعالیٰ جماعت پر زیادہ فضل نازل فرما رہا ہے اور اتنی جلدی جلدی فضل فرما رہا ہے کہ اس کی چمک دمک سے آنکھیں خیرہ ہو رہی ہیں۔[1]

پس خوش نصیب والدین اپنی اولاد کے لئے ایسے مثالی نقوش چھوڑ جاتے ہیں کہ ان کی اولادیں قربانی کے میدان میں سابقون میں جا شامل ہوتی ہیں۔یہی حال ڈاکٹر عبدالقدوس شہیدِ محترم اور محترم شہید عبدالقدیر صاحب کا تھا کہ دکھی انسانوں کی خدمت کرتے کرتے سندھ کی خشک زمین کو نذرانۂ محبت و وفا پیش کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور انہوں نے ثابت کر دیا کہ جو لوگ قوم کے لئے سر دیتے ہیں، ان کی منزل ہی جدا ہوتی ہے، وہ قوم کی احیاء کے لئے قربانی کرتے ہیں اور خود قربان ہو کر قوم کا سر فخر سے بلند کر دیتے ہیں۔

یاد رہے کہ یہ تکلیفیں، مصیبتیں اور اذیتیں ان کی نسلوں کے مراتب بڑھانے والی چیز ہوتی ہیں۔وہ حلاوت ایمان میں مضبوط تر ہو جاتے ہیں اور شیریں ثمرات حاصل کر لیتے ہیں۔تو آئیے آج ہم مولوی رحیم بخش صاحب کی دعاؤں کا ثمر دیکھتے ہیں:

مولوی رحیم بخش صاحب: مولوی صاحب آٹھ دس افراد کے کنبے پر مشتمل تلونڈی جھنگلاں میں مقیم تھے۔حکمت کا شعبہ اختیار کر کے عوام کی خدمت کیا

---

[1] خطبہ جمعہ، حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ

کرتے تھے۔ بہت اچھے طبیب تھے بلکہ طبیب کمال کے نام سے جانے جاتے تھے۔[1]

نیک لوگوں کو خدا تعالیٰ کی رحمت سے سچی خوابیں عموماً آیا کرتی ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ ۱۹۰۵ء میں مولوی رحیم بخش صاحب نے خواب دیکھا جو حضور کو لکھا۔ ''تخمیناً عرصہ چھ سات ماہ کا ہوا ہوگا کہ اس خاکسار نے خواب دیکھا کہ میرے گھر اللہ تعالیٰ نے لڑکا دیا۔ اس کا نام عبدالقدوس رکھا ہے۔ سو ویسا ہی اللہ تعالیٰ کے فضل سے لڑکا ہوا۔ اس کا نام عبدالقدوس رکھا ہے۔۔۔۔۔ یہ ہے وہ لڑکا جو نذرانہ لے کر حاضرِ خدمت ہو رہا ہے۔ قبول فرمایئے، دعا کیجئے، میں دعاؤں کا مستحق ہوں۔ از طرف، خاکسار۔ رحیم بخش، تلونڈی جھنگلاں۔[2]

یاد رہے کہ نذرانہ کے طور پر پیش کیا جانے والا وجود عبدالقدوس صاحب کا تھا جن کا نام پیدائش سے پہلے ہی رکھا گیا تھا۔ بیشک وہ شخص **القدوس** کا ایسا بندہ تھا جو خدا تعالیٰ کے حقوق کے ساتھ ساتھ بندوں کے حقوق ادا کرنے کے لئے ہی پیدا کیا گیا تھا۔ کون جانتا تھا کہ تلونڈی جھنگلاں کے مقام پر 1915ء میں پیدا ہونے والا گوہر سندھ کی خشک زمین کو اپنے خون سے سیراب کر کے مزیّن کرے گا اور خود قوم کا **نگینہ** بن جائے گا۔ سو اس نے ساری حیاتی بندوں کے حقوق ادا کرنے میں گزار دی۔ تقسیمِ ہند سے پہلے میٹرک تک تعلیم حاصل کر لی تھی۔ محترم جناب مہر سنگھ ان کے استاد تھے جنہوں نے بعد میں بیعت کر لی تھی اور بعد میں ان کا نام عبدالرحمٰن مہر سنگھ مشہور تھا۔ وہ بہت بلند پایہ کے استاد تھے۔ خصوصاً انگلش گرائمر وہ بہت عمدہ پڑھاتے تھے۔ بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ انگلش گرائمر گھول کر پلا دیتے تھے۔ ان کے بہت سے شاگرد اپنی ابتدائی انگلش

---

[1] اصحاب احمد، جلد یز دہم، صفحہ ۱۵۶

[2] اصحاب احمد، جلد یز دہم، صفحہ ۱۶۶

گرائمر اور ٹرانسلیشن کی بناء پر اعلیٰ تعلیم کے معیار تک پہنچ گئے تھے۔ چونکہ بزرگوار مولوی رحیم بخش صاحب ایک اعلیٰ درجے کے طبیب تھے اس لئے ان کے بچوں کا طب کی طرف راغب ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ ان کے دو تین بیٹے طب کی تعلیم سے عوام الناس کو فائدہ پہنچاتے رہے اور یہی ان کا نصب العین تھا۔ چنانچہ تقسیم برصغیر سے پیشتر سندھ میں آ گئے تھے اور ایک عرصہ تک سندھ میں سلسلہ کی ارضیات پر علاج معالجہ کا کام کرتے رہے۔ تقسیم برصغیر کے بعد آپ نواب شاہ میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گئے اور دکھی انسانیت کی خدمت میں منہمک ہو گئے۔

حقوق اللہ: حقوق اللہ کا جہاں تک تعلق ہے، ڈاکٹر عبدالقدوس صاحب خدا کے فضل سے ایک پختہ ایمان کے وارث تھے۔ وہ خدا تعالیٰ کی ذات پر بے حد توکل رکھتے تھے اور وہ جانتے تھے کہ خدا کے حقوق ادا کر کے ہی وہ روحانیت کی عمارت میں دداخل ہو سکتے تھے۔ اور وہ بخوبی علم رکھتے تھے کہ اس فانی دنیا میں فضلِ ربی کو جذب کرنے والی سب سے پہلی چیز صرف اور صرف تلاوت قرآن پاک ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ سورہ نور میں فرماتا ہے کہ ”یہ دیئے ایسے گھروں میں ہیں جن کے اونچا کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے اور ان میں خدا کا نام لیا جاتا ہے اور ان میں صبح و شام تسبیح کرتے رہتے ہیں“۔ [1]

پس ڈاکٹر صاحب نے روحانی خزائن سے محبت کر کے خود بھی قرآن مجید باترجمہ پڑھا اور گھر میں اپنے اہل وعیال کو بھی ترغیب دی۔ وہ بعد از نماز تہجد قرآن مجید کی تلاوت شروع کرتے تھے اور نماز فجر تک جاری رکھتے تھے۔ سو ہر مومن کا گھر جس نے قرآن مجید سے روشنی پائی اور قرآن کے تاج کو اپنے اور اپنی اولاد کے سر پر سجایا، وہ دنیا و آخرت میں سرخرو ہوا۔ چنانچہ محترم عبدالقدوس شہید

---

[1] سورہ نور، آیت نمبر ۴۷

نے ایک عملی قدم اٹھاتے ہوئے محترم حافظ فتح محمد صاحب کو اپنے گھر میں رہائش مہیا کی تا کہ وہ ان کے اہل وعیال کو قرآن مجید اور دینی مسائل سکھلائیں اور دینی ماحول میسر کریں، بلکہ محلے کے غیر از جماعت بچوں نے بھی حافظ فتح محمد صاحب سے استفادہ کیا۔اور حقیقت میں یہ قرآن مجید کی سچی محبت ہی ہے جوڈاکٹر قدوس صاحب کے اس عمل سے ظاہر ہے کہ وہ نہ صرف خود قرآن مجید پڑھتے بلکہ ایک احسن انتظام کرتے کہ ان کا ہر ملنے والا فیض یاب ہوجائے۔چنانچہ وہ بلا ناغہ رات سوتے وقت تفسیرِ کبیر ضرور پڑھتے۔اپنے شفاخانے میں بھی انہوں نے قرآ ن مجید کا ایک نسخہ رکھا ہوا تھا۔جب موقع ملتا،فوراً تلاوت فرماتے۔اگر کسی کو تحفہ دینا مقصود ہوتا تو ہمیشہ اپنے پیارے مولیٰ کریم کا کلام ہی بطور تحفہ پیش کرنے میں فخر محسوس کرتے۔اسی لئے اپنی بچیوں کی شادیوں پر تفسیرِ کبیر اور روحانی خزائن کے سیٹ تحفے میں دیئے اور ہمیشہ تاکید کی کہ ان جواہر پاروں کو سجانا ہے تو دل ودماغ میں سجانا، خدا تم سے راضی ہوگا۔انشاء اللہ

قارئین! یادرہے کہ یہ سب خدا تعالیٰ سے محبت کی نشانیاں ہیں کیونکہ جس نے بھی اظہار محبت کرنا ہو، وہ اپنے پیارے کی پیاری باتوں کو حذرِ جان بناتا ہے، دل ودماغ میں سجاتا ہے اور بالآخر فتح یاب ہو جاتا ہے۔ڈاکٹر شہید کو اپنے مولیٰ کی ہستی پر تو اعتماد اور توکل ہی بہت تھا۔وہ اکثر شب بیداری میں اسے تلاش کرتے، کافی دیر تک روتے رہتے، فرماتے تھے کہ خدا تعالیٰ سے مانگتے جاؤ، وہ خود ہی جو بہتر ہوگا، ہمارے لئے کردے گا۔ خدا تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا ضروری ہے اور حاضر ہونے کا طریقِ کار یہی تھا کہ راتوں کو بستر کی بجائے جائے نماز پر زیادہ دیکھے جاتے تھے اور کمال یہ تھا کہ ان کی عادت بچپن یعنی ۱۴ سال کی عمر سے جاری وساری تھی۔ خدا تعالیٰ رحیم وکریم ہے کہ

عشق الٰہی ۔۔ خیرالوریٰ: خدا تعالیٰ اور اس کے محبوب محمد مصطفیٰ ﷺ سے محبت ایک ایسی چیز ہے جو مومن کو القابات سے ممتاز کر دیتی ہے اور شہید کا امتیاز یہی ہے کہ وہ عام طور پر خدا اور اس کے رسول کی محبت میں اس حد تک گم ہو کہ وہ خود کو بھول جائے اور یہ محبت کا معراج ہی ہوتا ہے کہ اپنا سر سوغات میں پیش کر دیتا ہے۔ تو آیئے آج ڈاکٹر شہید کی زندگی کے اس پہلو پر بھی غور کر لیتے ہیں کہ وہ اپنے خالق اور اس کے محبوبؐ سے کس حد تک عشق رکھتے تھے۔

والذین جاھدُو فِینا لَنَھدِیَنھُم سُبُلَنا وانّ اللہ لَمَع المَحسِنِین۔ (۷۰ آیت العنکبوت)

ترجمہ: ''یعنی وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی کوشش کرتے ہیں، ہم انہیں ضرور ایسے راستوں کی طرف آنے کی توفیق بخشیں گے۔ اور اللہ یقیناً محسنوں کے ساتھ ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے کہ وہ لوگ جو ہماری محبت اور ہمارے وصال کے لئے جدوجہد کرتے ہیں، انہیں ہم متواتر ان راستوں کا پتہ بتاتے ہیں جو ہم تک پہنچنے والے ہیں۔

گویا

''وہ لوگ جو سچے دل سے کوشش کرتے ہیں کہ انہیں خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہو تو اللہ تعالیٰ اپنے قرب کے لامتناہی راستوں پر چلاتا چلا جائے گا اور ان کے دامن کو گوہر مقصود سے بھر دے گا۔'' ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پس جب انسان اس ارادہ اور نیت کے ساتھ اچھی چیز کو پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے تو پھر نیکیوں کی طرف اس کا قدم اٹھنا شروع ہو جاتا ہے کیونکہ کوئی نیکی نہیں جو اس سے اگلی نیکی کی توفیق نہیں دیتی۔ اگر کوئی انسان سچے دل سے صدقہ دیتا ہے تو ضرور ہے کہ اسے نماز کی بھی توفیق ملے اور زکوٰۃ کی بھی توفیق ملے اور روزہ کی بھی توفیق ملے اور اگر کوئی

اخلاص کے ساتھ روزے رکھتا ہے تو ضرور ہے کہ اس نیکی کے نتیجہ میں اسے نماز اور زکوٰۃ اور حج کی توفیق ملے کیونکہ ہر نیکی دوسری نیکی کی طرف لے جاتی ہے۔''[1]

تاثرات سلیم شاہجہانپوری: پس شہید محترم بخوبی جانتے تھے کہ نماز روحانی جسم کی اصلاح کا ایک ذریعہ ہے۔ اور یہ ایک ایسی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر انسان خدا سے ملاقات کر سکتا ہے۔ خصوصاً نماز با جماعت کا بہت التزام رکھتے تھے۔ اس کے متعلق محترم میاں سلیم شاہجہانپوری الفضل میں اپنا روزانہ کا معمول کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ ''خاکسار کچھ عرصہ کے بعد کراچی سے نواب شاہ گیا ہوا تھا اور اپنے مکان واقع فیملی کوارٹرز میں مقیم تھا۔ روزانہ کا معمول تھا۔ آٹھ نو بجے تک ناشتہ کر کے گھر سے نکل جاتا اور چند قدم کے فاصلہ پر واقع ڈاکٹر صاحب کی کلینک ''شفا میڈیکو'' واقع مارکیٹ روڈ پر پہنچ جاتا۔ ڈاکٹر صاحب خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہتے اور اپنے قریب کرسی پر بٹھا لیتے۔ کچھ دیر گفتگو ہوتی، پھر مریضوں کا تانتا لگ جاتا اور ڈاکٹر صاحب کبھی اندر اور کبھی باہر آتے اور باری باری مریضوں کی نبض دیکھ کر دوا تجویز کرتے۔ کسی کو انجکشن لگاتے، کسی کو دوائیں استعمال کرنے کی ترکیب سمجھاتے۔ میں اس دوران اخبارات پڑھتا رہتا۔ پھر اجازت لے کر چلا جاتا اور دیگر احباب سے ملاقات کرتا ہوا ایک بجے محمود ہال پہنچ جاتا جہاں ڈاکٹر صاحب بھی مریضوں سے فارغ ہو کر بلا ناغہ پہنچ جاتے اور ہم نماز باجماعت ادا کرتے تھے۔

حضرت مصلح موعود کا فرمان: مندرجہ بالا عبارت میں بزرگوار سلیم شاہجہانپوری نے اپنے معمول کا ذکر برموقع شہادت ڈاکٹر قدوس صاحب کیا ہے

---

[1] تفسیرِ کبیر

مگر ہمارے لئے ایک جملہ ایسا ضبطِ تحریر میں لائے ہیں کہ جس نے شہید محترم کی زندگی پر نمایاں روشنی ڈالی ہے اور یہ جملہ بر موقع اور بر محل سامنے آیا ہے، کیونکہ میں یہی بیان کرنا چاہتی تھی اور یہی مقدس فرمان میرے علم میں محفوظ ہے کہ ''میں نے اپنے تجربہ میں نماز باجماعت سے بڑھ کر کوئی چیز نیکی کے لئے موثر نہیں پائی۔'' خلیفۃ المسیح الثانی المصلح موعود قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ ''نماز کا پابند خواہ کتنا ہی بداعمال کیوں نہ ہو، اس کی ضرور اصلاح ہوسکتی ہے اور وہ ضائع نہیں ہوتا اور میں شرح صدر سے کہہ سکتا ہوں کہ آخری وقت تک اس کے لئے اصلاح کا موقعہ ہے مگر وہ نماز باجماعت کا پابند اس رنگ میں ہو کہ اس کو اس میں لذت حاصل ہو۔''[1]

اسی طرح عزیزہ عظمیٰ فرح کہتی ہیں کہ ''پانچوں وقت کی نماز بیت الذکر میں جا کر ادا کرتے اور تہجد گزار بھی تھے۔ صبح سویرے اٹھ جاتے اور سب گھر والوں کو بیدار کرتے اور نماز کی تلقین کرتے۔ نماز سے واپس آ کر قرآن پاک کی تلاوت کرتے اور رات کو نماز کے بعد تفسیرِ کبیر اور دوسری دینی کتب پڑھتے ہوئے سو جاتے تھے۔ پھر جہاں تک انفاق فی سبیل اللہ کا تعلق ہے تو سلسلہ کی مالی خدمات میں بھی پیش پیش رہے۔ امامِ وقت کی ہر تحریک پر لبیک لبیک کہنا اپنا شعار بنالیا تھا۔ موصی تھے اور اپنا حصہ آمد وقت پر ادا کر دیتے تھے۔ صد سالہ جوبلی کے لئے ایک خطیر رقم کا وعدہ کیا اور ادائیگی کا خاصا خیال رکھتے تھے، مقامی ضرورتوں پر لبیک کہتے رہے۔''

الغرض یہ تو تھے محبتِ خدا اور اتباعِ رسول محمد مصطفیٰ ﷺ کے مختلف زاویے جو کسی نہ کسی رنگ میں ہمیں ان کی تمام زندگی میں نظر آتے ہیں مگر ایک نمایاں چیز جو تمام تمام زندگی پر محیط رہی، وہ ہے خدمتِ خلق ۔۔۔ یہ جذبہ ان کی

---

[1] روزنامہ الفضل، ۲۲ نومبر ۱۹۸۹ء

شب و روز میں ہر پہلو سے نمایاں نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہ جذبہ ان کو وراثت میں ہی ملا تھا، پھر بھی انہوں نے اپنے اوقات کار کو اس طرح منظّم کیا ہوا تھا کہ کوئی دکھی شخص وقت کی قلّت کی وجہ سے واپس ناکام نہیں جاتا تھا بلکہ ان کا طریق کار تھا کہ مریض کے گھر جا جا کر اس کے دکھوں کو بانٹتے تھے۔ اور بڑے اعلیٰ پیمانہ پر لوگوں کو فائدہ پہنچاتے تھے یعنی کبھی مریض کا علاج کر کے اور کبھی مرض کی پہچان کر کے اور کبھی روحانی غذا مہیا کر کے وہ بہر طور اپنے اردگرد کے لوگوں کو شفا دینے کی سعی ضرور کرتے تھے۔ شفا تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ مگر وہ دعا اور دوا سے خدا کو راضی کرتے اور لوگوں کے لئے رضا کی راہیں ہموار کرتے تھے۔ چونکہ لمبا عرصہ سندھ میں رہے، اس لئے یہاں کے شہری اور دیہاتی سندھی بھائیوں کے مزاج شناس ہو گئے تھے اور لوگ جوق در جوق آپ کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ بعض اوقات آپ کے مطب میں تِل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ میں شفا رکھی تھی۔ وہ ہاتھ اپنے مریضوں کی صحت یابی کے لئے دعائیں بھی کرتے تھے۔ سندھی زبان روانی سے بولتے تھے۔ اور ٹھیٹھ دیہاتوں کی زبان بھی سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو توکل، غناء اور محبت کا ایک مثالی جذبہ دیا ہوا تھا۔ وہ نڈر اور بے خوف ہو کر مریضوں کے گھروں میں بغرضِ علاج جاتے تھے جبکہ انہیں دھمکیوں کے خطوط بھی موصول ہوتے تھے۔ مگر جب کسی انسان کی سرشت میں ہی ''اوروں کے کام آنا'' پڑ گیا ہو تو وہ اپنی زندگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بھی کود جاتا ہے۔ بیشک حقوق العباد کا جذبہ بھی اپنی ایک ممتاز شان رکھتا ہے۔ گویا وہ کلمۂ توحید کا زندہ اور روشن ثبوت تھے یعنی انسان خدا سے محبت کرتا ہے، اس کے حقوق ادا کرتا ہے، بندوں کے حقوق ادا کرتا ہے، ان سے وفا کرتا ہے، ان پر رحم کرتا ہے، ان کے دکھ بانٹتا ہے، ان کے دھندے سنوارتا ہے اور قربانی کر کے ان کے لئے شاہراہِ ترقی تیار کرتا ہے۔ اور یہی اس کی زندگی کا تمام

مقصد ہوتا ہے۔ پس یہی حال ڈاکٹر عبدالقدوس شہید کا تھا کہ وہ خدا اور اس کے رسول کریم ﷺ کی محبت کو انسانوں سے محبت کر کے حاصل کر لیا کرتے تھے۔

لیکن

کبھی کبھی انہی انسانوں میں سے ایک ظالم ہاتھ ایسا بھی اٹھتا ہے جو اپنے محسن کو جو ان کے لئے صحت وسلامتی، سکون اور نیند کی دوائی کی تلاش میں سرگرداں ہوا کرتا تھا، اُسی مسیحا کو ہمیش کی نیند سلا دیتا ہے اور یہ سوء بختی قوموں میں آتی ہی اس وقت ہے جب قوموں کا مقدر سو چکا ہوتا ہے۔

قارئین! آپ نے پڑھا اور سنا تو ضرور ہوگا کہ میرے لوگوں میں سے اکثر ڈاکٹر، حکیم، استاد اور ادیب اپنے ہی مریض اور شاگرد کے ہاتھوں سے شہادت کے مرتبہ تک پہنچ گئے ہیں۔ یہی حال ڈاکٹر قدوس شہید کا ہوا کہ ایک دوپہر جبکہ سورج اپنی مکمل آب وتاب سے روشنی دے رہا تھا اور کسی **کالے دھندیے** کی گنجائش نہیں تھی، میرے ملک کے کسی درندہ صفت اور بزدل آدمی نے پیچھے سے وار کر کے انسانیت کا ہمدرد ہمیشہ کے لئے چھین لیا۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون.

قارئین! آپ کو تو یاد ہوگا کہ اسی زمین پر چند ماہ پہلے اسی نمونے سے کسی بدبخت نے ڈاکٹر صاحب کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب کو شہید کر دیا تھا لیکن ڈاکٹر عبدالقدوس ہراساں نہیں ہوئے بلکہ حضور سیدنا امیر المومنین خلیفۃ المسیح الرابع کی خدمت میں اطلاعاً عرض کیا کہ ”پیارے آقا، میرے عزیز بھائی، ہمدرد اور غمخوار بھائی عبدالقدیر صاحب ایک بدبخت کی گولیوں سے شہادت کا درجہ پا گئے اور بزدل اپنی عاقبت تباہ کر گیا۔ پھر حضور سیدنا خلیفۃ المسیح الرابع کے لئے دعا کے ساتھ درخواست کرتے ہیں کہ دعا کریں ہمیں خدا مل جائے۔ آمین۔ سو وہ شخص بہادر اور دلیر تھا۔ ایک ولولہ قربانی اور سچی خواہش رکھتا

تھا کہ خدا مل جاوے، سو وہ گھڑی تھی کہ ان کی دلی خواہش خدا نے پوری کر دی اور ٹھیک ۵۷ دن کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی **خدمات** کے عوض انہیں منعم علیہ گروہ میں شامل فرما دیا۔ بیشک وہ کھرا اور ایک سچا انسان تھا۔ میاں سلیم شاہجہانپوری آپ کے توکل اور تقویٰ کا ذکر کچھ اس طرح کرتے تھے۔ ''اللہ تعالیٰ نے آپ کو توکل کا اعلیٰ مقام عطا فرمایا تھا۔ لوگوں سے خندہ پیشانی سے ملتے اور مولا کی رضا پر ہمیشہ راضی رہتے۔ آپ کی شریکِ حیات پر فالج ہوا اور وہ عرصہ تک صاحبِ فراش رہیں۔ ان کے علاج معالجہ اور تیمارداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ پھر ان کے انتقال پر انتہائی صبر کا نمونہ پیش کیا۔ بڑے بیٹے عبدالحیٔ جو واپڈا میں سپروائزر تھے۔ کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہوئے اور لمبے عرصے تک صاحبِ فراش رہے، ان کا علاج بھی تندہی سے کرتے رہے۔ ایک صاحبزادی چاء نوشی کے درمیان حرکت قلب بند ہو جانے سے اللہ کو پیاری ہو گئی۔ ان سب صدمات کو برداشت کیا اور جبین صبر و رضا پر کوئی بل نہ آنے دیا۔[1]

جذبۂ قربانی: المختصر محترم عبدالقدوس شہید بہت سی مثالی خوبیوں کے مالک تھے۔ مگر بہادری اور بے خوفی ان کا امتیازی خُلق تھا۔ ان کے بھائی کی شہادت کا اثر صرف اس رنگ میں ہوا کہ قربانی کو انہوں نے جذب کر لیا۔ اور وہ ہر وقت اس منزل کی تلاش میں رہتے کہ کوئی موقع غفلت کی نذر نہ ہو جائے۔ چنانچہ شہید محترم کے لئے وقت کے امام حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے گواہی دی۔ چند دن پہلے مجھے ان کا خط موصول ہوا۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ میرا بھائی قربان ہوا ہے مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ میرے دل میں جذبۂ قربانی پہلے سے کئی گنا بڑھ گیا ہے۔ انہوں نے میرا ایک بھائی قربان کیا ہے مگر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری ساری اولاد بھی اس راہ میں قربان ہوتی چلی جائے تو مجھے اس کا دکھ نہیں ہوگا، اس

---

[1] الفضل، ۲۲ نومبر ۱۹۸۹ء

لئے میرے لئے آپ کوئی فکر نہ کریں۔ [1]

پس یہی بے خوفی، دلیری اور جذبۂ قربانی تھا جو انہیں حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کی طرف لے گیا۔ کہ دونوں بھائی خدا کی مخلوق کی خدمت کرتے کرتے راہِ مولیٰ میں قربان ہو گئے۔ اور حقوق العباد کی ادائیگی بھی خدمت خلق کا معراج ہے کہ دکھی مخلوق کے لئے آسانیاں ڈھونڈتے ڈھونڈتے عین فرائض کی ادائیگی کے دوران خدا تعالیٰ کے روشن چہرہ کے نور سے منور ہو گئے۔ **الحمد لله علی ذالك**

بیشک وہ سچے اور کھرے انسان تھے: کس محبت اور پیار سے حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز ان کی قربانی کا سُن کر فرماتے ہیں کہ:

''کتنا سچا اور کھرا انسان تھا، کیسے اس کے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز بلند ہوئی جب ان کی قربانی کی اطلاع مجھے ملی تو بے اختیار میری زبان پر قرآن کریم کی یہ آیت جاری ہوئی ''ان خدا کے بندوں میں وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی نیتوں کو پورا کر دکھایا، جو اپنے قول اور اپنی تمناؤں میں سچے نکلے۔'' [2]

وہ اپنی تمناؤں میں سچے انسان تھے اور پھر خدا تعالیٰ اپنے بندوں کی نیتوں کے مطابق پھل دیتا ہے۔ وہ اکثر کہتے تھے کہ ''میرا چھوٹا بھائی مجھ سے چھوٹا تھا مگر شہادت میں مجھ سے نمبر لے گیا۔''

یہ سابقون میں شامل ہونے کی تڑپ تھی۔ پھر ایک دن ڈاکٹر عبداللہ قریشی صاحب اور نسیم سیفی صاحب، ایڈیٹر الفضل کا کھرا اور سچا دوست ڈاکٹر عبدالقدوس جب ۷۵ سال کی عمر کو پہنچا تو کسی ناعاقبت اندیش نے پشت سے کاربین کا فائر کر کے ان کی عاقبت سنوار دی اور ان کو اس اعلیٰ مقام پر لے گیا

---

[1] خطبہ جمعہ، ۲۹ ستمبر ۱۹۸۹ء

[2] خطبہ جمعہ، ۲۹ ستمبر ۹۸۹

جس کی وہ تمنا کرتے تھے۔ بیشک سنتوں کا پھل اللہ تعالیٰ اپنے فضلوں سے دیا کرتا ہے اور ڈاکٹر صاحب تو تھے بھی ایک بزرگ مخلص انسان۔

شہادت کا تفصیلی بیان اور اس کا جائزہ اس لئے ضروری ہے کہ جذبوں کو زندہ رکھا جا سکے اور اس Chain کو پختہ کیا جائے جس کی ہر کڑی دوسری سے مضبوط تر ہو کر سامنے آ رہی ہے۔

واقعۂ شہادت: جمعرات ۲۸ ستمبر ۱۹۸۹ء کو پونے ایک بجے کسی نہ معلوم شخص نے کاربین کا فائر کر کے ہلاک کر دیا۔ آپ نواب شاہ شہر میں اپنے کلینک واقع مارکیٹ روڈ سے اٹھ کر کسی مریض کو دیکھنے گئے۔ وہ واپس آ رہے تھے کہ اپنے کلینک سے سو گز کے فاصلے پر مصروف ترین سڑک مارکیٹ روڈ پر کسی شخص نے پُشت پر کاربین لگا کر فائر کر دیا۔ حملہ آور دو تھے، دونوں حملہ آور فرار ہو گئے۔

مکرم ڈاکٹر صاحب کو فوری طور پر ایدھی ایمبولینس کے ذریعہ قریبی سول ہسپتال میں پہنچایا گیا لیکن وہ دن کے ایک بجے کے لگ بھگ اپنے مولیٰ کے حضور حاضر ہو گئے۔[1]

تکفین و تدفین: اسی روز رات کو نواب شاہ میں ڈاکٹر عبدالقدوس صاحب کی رہائش گاہ پر مکرم کرامت اللہ خادم صاحب مربی سلسلہ نے نماز جنازہ پڑھائی جس کے بعد رات دس بجے سپر ایکسپریس کے ذریعے جسد خاکی کو ربوہ لایا گیا۔ اگلے روز ۲۹ ستمبر ۱۹۸۹ء کو جنازہ ربوہ پہنچا جہاں مولوی بشارت احمد بشیر صاحب کے گھر لایا گیا۔ ربوہ کے محلوں میں اور نماز جمعہ پر اطلاع دے دی گئی تھی، چنانچہ نماز عصر کے بعد بیت المبارک میں محترم مولانا سلطان محمود انور صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اہل ربوہ نے ہزاروں کی تعداد میں نماز جنازہ

---

[1] الفضل، یکم اکتوبر ۱۹۸۹ء

میں شمولیت کی اور موصوف کا آخری دیدار کیا۔[1]

آج ۲۹ ستمبر ۱۹۸۹ء مسجد فضل لنڈن کے ڈائس سے ایک با برکت اور ارفع آواز بلند ہوئی۔ میرے آقا، سیدنا امامِ وقت نے تاکیداً فرمایا۔ ''اے احمدی! تو اپنے درد کی لہروں کی حفاظت کر اور اس سے مایوس نہ ہو۔ ہاں، اس درد کی لہروں کو دعاؤں کے بخارات میں تبدیل کرتا جا۔''

ہمارے مقدس وجود امیر المومنین ایدہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے ان درد کی لہروں کو فضل ربی قرار دیتے ہوئے فرمایا ''جب بھی ابتلاء آئیں گی، وہ ان کو مغلوب نہیں کر سکیں گے بلکہ ان پر وہ غالب آئیں گے۔ اپنی صداقت کے ذریعے، اپنی سچائی کے ذریعے، اپنے نیک ارادوں کے ذریعے اور اپنی قربانیوں کے جذبے کے ذریعے، بس ان جذبوں کو زندہ رکھو۔ کسی کی جان لیں گے تو سارا خاندان جان قربان کرنے لئے آ جائے گا۔ اپنی دکھی درد کی لہروں سے بے نیاز جماعت کو مخاطب کر کے امامِ وقت خلیفۃ المسیح الرابع خدا کی قسم کھا کر یقین دلاتے ہیں کہ آپ پر بے شمار خدا کے فضل ہوں گے یہاں تک کہ جواب تک ہوئے، ان کو بھول جائیں گے۔ کثرت کے ساتھ خدا آپ کو بڑھاتا چلا جائے گا اور آپ ہیں اور آپ کی سچائی ہے جس نے دنیا پر غالب آنا ہے، باقی ہر بات جھوٹی ہے، ہر بات قصہ ہے، یہی وہ حقیقت ہے، یہی وہ حقیقت ہے جسے ہم عیسوی حقیقت کہہ سکتے ہیں، یہی موسوی حقیقت تھی، یہی ابراہیمی حقیقت تھی، اور یہی حقیقت نوح کی حقیقت ہے۔ پس

---

[1] الفضل، یکم اکتوبر ۱۹۸۹ء

مایوس ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ نمونہ زندہ رکھنے کے لائق ہے جو ڈاکٹر عبدالقدوس نے دکھایا ہے۔ جانی قربانی ہمیں مرعوب نہیں کر سکتی بلکہ خدا کی راہ میں قربان کرنے کی تمناؤں کو اور زیادہ بڑھا جائے گی"۔۔۔۔

یہ مبارک صدا ہر احمدی کے در و دیوار تک پہنچی اور دل میں اترتی گئی، خصوصاً ڈاکٹر عبدالقدوس شہید کے پسماندگان محترمہ امنہ القدوس صاحبہ، محترم عبدالقیوم صاحب، محترم عبدالغفور صاحب، محترم الماجد خاں صاحب، امتہ الصبوح صاحبہ اور محترم عبدالبصیر خان صاحب کے لئے یہ ارشادِ امام متقاضی ہے کہ قربانی کا یہ ثمر پھلے پھولے اور بڑھے تا کہ آپ کے محترم شہید کا ہر نقش پہلے سے زیادہ واضح اور روشن ہو جائے۔ آمین ثم آمین، اور آگ سے کندن بن کر نکلنے کا عزم آپ لوگوں کی زندگی کا نصب العین بن جائے۔ ثم آمین۔ بلکہ دعا ہے کہ وہ پختہ اور مضبوط نقوش جو ڈاکٹر شہیدِ محترم نے چھوڑے ہیں، ان کے خاندان کا ہر فرد مرسم کرلے اور خلاء پیدا نہ ہو۔ آمین۔ قربانی کی یہ Chain کبھی نہ ٹوٹنے پائے۔ آمین۔

ہمارا ثانی کوئی نہ ہوگا کہ ہم ہیں اصحاب دور آخر
ہمارے نقشِ قدم پر چل کر ہی کامران ہوں گے آنے والے

الغرض وہ صالح شخص شہید عبدالقدوس کتنے خوش قسمت تھے، کہ جن کی صدیقیت کی گواہی امامِ وقت نے دے دی اور شہادت کا مرتبہ اس عظیم بہادر انسان کے راہ مولیٰ میں جان قربان کر کے خود حاصل کرلیا۔ انہوں نے اپنی آرزو کے مطابق جان جانِ آفریں کے سپر کر کے شہادت کی مہر حاصل کر لی۔ یہی وہ

عبادات وریاضیات کا ماحاصل ہوتا ہے کہ انسان کو قربِ محمد رسول پاک ﷺ میسر آجائے۔ پس اے شہید عبدالقدوس صاحب!! آپ کو مبارک ہو کہ درِ مصطفیٰ پر آپ کی دستک پہنچ گئی۔ الحمد للہ علی ذالک

شہید کا مقام

حضرت انس فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص بھی جنت میں داخل ہوتا ہے، وہ وہاں سے واپس دنیا میں آنا پسند نہیں کرتا۔ اگرچہ اس کو زمین کی ساری دولتیں مل جائیں۔ مگر شہید کی جو عزت اور تکریم آخرت میں کی جاتی ہے، اس کی وجہ سے وہ تمنا کرتا ہے کہ وہ دنیا میں لوٹے اور دس دفعہ خدا کی راہ میں مارا جائے۔''

(صحیح بخاری)

اک نظر میں

نام	:	ڈاکٹر عبدالقدوس
والد محترم	:	مولوی رحیم بخش صاحب
جائے پیدائش	:	تلونڈی (انڈیا)
تعلیم	:	میٹرک (طب کی تعلیم)
عمر	:	۱۹۱۵ء
قد وقامت	:	۵ فٹ ۶ انچ
لباس	:	شلوار، قمیض، جناح کیپ
عہدہ بوقت شہادت	:	امیر جماعت نواب شاہ
تاریخ شہادت	:	۲۸ ستمبر ۱۹۸۹ء
آلۂ شہادت	:	کاربین
لواحقین	:	۴ بیٹے اور دو بیٹیاں
نماز جنازہ	:	محترم مولوی سلطان محمود انور
تدفین	:	بہشتی مقبرہ
شمائل	:	علی گڑھ (طب کی تعلیم)
		خوش اخلاق، بہادر، کھرا انسان
		جان نثارِ دین، داعی الی اللہ
		خلیفۂ وقت سے عشق تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ ونصلی علی رسول کریم

ھوالناصر، خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

ملک محمدؐ دین صاحب شہید

کلمے کا سفر ایک ایسی داستان ہے کہ ہر راہ گزر پر پتھروں سے واسطہ پڑتا ہے، کانٹے راہوں میں بچھے ہوئے ملتے ہیں، آہنی سلاخوں سے داغا جاتا ہے،

لیکن

کلمے کا مسافر بے نیاز، بے دریغ اور بے پرواہ ہو کر رواں دواں ہے اور وہ یہ جانتا ہے کہ کئی ہمسفر ان راہوں میں مارے گئے، کبھی سنگسار کئے گئے، کبھی بوٹوں تلے روندے گئے اور کئی اندھیری کوٹھڑیوں میں دھکیلے گئے اور بالآخر ان کی زندگی کے چراغ گل کر دیئے گئے۔ یہ بھی ایک ایسا ہی مسافر تھا جو کلمۂ توحید کے سفر کا ہمراہی تھا لیکن انہی کال کوٹھڑیوں میں شہادت کا درجہ پا گیا۔

ہاں بے شک، یہ چیز اُن کے علم میں محفوظ تھی کہ۔۔۔۔شہادت ذاتِ باری تعالیٰ کا ایک انعام ہے جو بندے کو کسی نہ کسی طرح رضائے الٰہی، خوشنودیٔ مولیٰ، اتباع رسولِ کریم ﷺ یعنی اعمالِ صالحہ، خدمتِ خلق اور ادائیگی حقوق اللہ اور حقوق العباد کے نتیجہ میں ملتا ہے لیکن خوشنودی مولیٰ کا یہ بیج پھل دار درخت بنتا ہی اس وقت ہے جب فضلِ الٰہی کا پانی اسے میسر آ جاتا ہے اور فضل الٰہی کا پانی حاصل کرنے کے لئے وہ شخص تقریباً ۷ سال آہنی سلاخوں کے پیچھے صعوبتیں برداشت کرتا رہا کیونکہ راہِ خدا میں لڑنے والے کبھی غازی ہو کر لوٹتے ہیں اور کبھی

شہادت کا رتبہ پا جاتے ہیں۔ چنانچہ آج ہم ایک ایسے پاکیزہ وجود کا ذکرِ خیر کرتے ہیں۔ جو کسی آلۂ قتل سے قربان نہیں ہوئے بلکہ خدا تعالیٰ کی رحمت ان پر سایہ فگن ہوئی اور وہ خدا کے ہاتھوں میں ایسے سمیٹے گئے کہ مرتبہ شہادت پا کر منعم علیہ گروہ میں جا شامل ہوئے۔ **الحمد لله علىٰ ذلك**

محترم ملک محمدؐ دین صاحب احمدی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم فقیر محمدؐ صاحب، محترم حافظ حامد علی صاحب کے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ گھرانہ دینی لحاظ سے ایک امتیازی مقام رکھتا تھا۔ دونوں بھائی خدا کے فضل سے ایک مربّیانہ شان کے مالک تھے۔ تعلیم و تربیت اولاد میں ممکنہ حد تک کوشاں رہتے تھے کیونکہ خدا تعالیٰ کے محبوب حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کے رفقاء میں سے تھے اور ۳۱۳ صحابہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ملک فقیر محمدؐ صاحب، تھیہ غلام نبی ضلع گورداسپور میں پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے محترم فقیر محمدؐ صاحب کو آٹھ بچے عطا کیے جن میں چھ بیٹے تھے۔

(۱) محمد اسمٰعیل۔ (۲) محمد عمر۔ (۳) محمدؐ اسحاق۔ (۴) محمد دین۔ (۵) فضل دین اور رحمت اللہ ان کے نام تھے۔ دو بیٹیاں جن کے نام فاطمہ بی بی اور حرمت بی بی تھے۔ ملک محمدؐ دین صاحب اپنے والد صاحب کی چھٹی اولاد تھے۔ درس و تدریس کا محترم فقیر محمدؐ صاحب کو بہت شوق تھا۔ لہٰذا وہ بچوں کی نگہداشت پر خاصی محنت کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے محمدؐ دین صاحب کو پڑھنے کے لئے اپنے گاؤں سے باہر داخلہ لے کر بھیج دیا اور خوش ہوئے کہ علم کی دولت اکٹھی کرنے کے لئے میرا بیٹا راضی برضا سات (۷) میل روزانہ پیدل چل کر جاتا ہے۔ چنانچہ اپنے گاؤں تھہ غلام نبی سے دور کسی معیاری اسکول میں پڑھائی حاصل کرنے کے لئے پیدل آنا جانا محمدؐ دین صاحب کا معمول تھا۔ اگرچہ فقیر محمدؐ صاحب کا آبائی پیشہ زمینداری تھا مگر وہ روشنی جو وقت کے امام

حضرت اقدس مسیح علیہ السلام سے حاصل ہوئی تھی، متقاضی تھی کہ اولاد کو علم و عرفاں کے نور سے منور کیا جائے چنانچہ تمام تر کوشش یہی رہی کہ اولاد اچھی معیاری تعلیم حاصل کر لے۔ اگرچہ شہید محترم نے سرکاری طور پر تعلیم میٹرک تک حاصل کی مگر ایک بلند معیار کی تعلیمی زندگی گزاری کیونکہ مطالعہ کتب خصوصاً روحانی خزائن انسان کو علم وادب کے وہ خزانے عطا کرتا ہے کہ جو کسی بھی یونیورسٹی سے ممکن نہیں۔ تفسیر صغیر و تفسیرِ کبیر کا مطالعہ اور روحانی خزائن سے دلی لگاؤ انسان کو ایک ایسا مُربی بنا دیتا ہے کہ وہ ہر میدان میں نکھر جاتا ہے اور یہ نکھار اسے دنیا و مافیہا میں ایک مثالی مقام عطا کر دیتا ہے۔ سو محمدؐ دین صاحب نے علم و عرفاں یہیں سے اکٹھا کیا۔

بیشک یہ کنبہ خدا تعالیٰ کے سچے مسیح کا سچا فرمانبردار تھا، دیندار تھا اور اپنی اولاد کے لئے ہمہ تن مصروف تھا کہ تقسیم ہندوستان کی وجہ سے پاکستان میں منتقل ہونا پڑا۔ ضلع گورداسپور سے ضلع لاہور میں مستقل رہائش پذیر ہوئے اور محمدؐ دین صاحب نے بوجہ ملازمت محکمہ پولیس مختلف مقامات پر رہائش اختیار کی۔ مثلاً کچھ عرصہ وہ شیخوپورہ، لاہور، سیالکوٹ اور ساہیوال کے مقام پر متعین رہے اور ساہیوال میں ہی ریٹائر ہوئے۔ چونکہ وہ بہت فرض شناس اور ذہین تھے، اس لئے ہمیشہ لوگوں کے مسائل حل کرتے رہے۔ اگرچہ ان کی ملازمت انسپکٹر پولیس کی تھی، پھر بھی ہمدردی اور موقع شناسی ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ ہاں، وہ مناسب وقت پر مناسبِ حال عمل کرنے کے عادی تھے۔ امامِ وقت کی آواز ان کے لئے روح کی غذا تھی۔ اور امامِ وقت کی سچی اطاعت آپ کے ارشادات سے وابستہ ہوتی ہے جو ہمیں عموماً کتابوں اور خطبات میں میسر آتی ہے۔ چنانچہ ملک صاحب ان کتابوں سے ہی محبت و قربانی کا سبق سیکھتے رہے اور **ان خزائن کا حاصل شدہ علم ان کی شناخت بن گیا۔**

ملک صاحب نے اپنی زندگی کا ساتھی دو دفعہ منتخب کیا۔ پہلی بار محترمہ زہرہ صاحبہ سے شادی ہوئی۔ ڈیڑھ سال کے بعد جن کا انتقال ہوگیا۔ پھر دوسری بار حمیدہ سلطانہ بیگم صاحبہ کو جو کہ حضرت حافظ حامد علی صاحب مرحوم ومغفور کی نواسی تھی، انہیں اپنے رشتۂ ازواج میں منسلک کیا اور اس طرح ایک دیندار اور احمدیت سے خاص لگاؤ رکھنے والی خاتون ان کی ساتھی بن گئی تھیں۔ یہ ساتھ بہت سی برکتوں کا متحمل ہوا کہ خدا تعالیٰ نے ملک صاحب کو مضبوط و پختہ ایمان عطا کیا۔ ان کا یہ پختہ ایمان ہی تو تھا جو آخری سانس تک مصائب کے سامنے آہنی دیوار کی طرح بے خوف ڈٹا رہا اور ثابت قدمی کا اعلیٰ ترین نمونہ دکھایا۔

خدا تعالیٰ نے محترمہ حمیدہ سلطانہ صاحبہ اور ملک محمدؐ دین صاحب کو دو بیٹے ملک نعیم الدین صاحب، معین الدین حمید صاحب اور چار بیٹیاں امتہ المنان صاحبہ، سعادت کوثر صاحبہ، امتہ الرفیع صاحبہ اور امتہ الصبوح صاحبہ عطا کیں۔ یہ خاندان بخیر و خوبی ساہیوال میں سکونت پذیر رہا۔ چونکہ محترمہ حمیدہ صاحبہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جو نیکی وتقویٰ میں مثالی مقام رکھتا تھا۔ مثلاً وہ محترم حضرت حافظ حامد علی صاحب کی نواسی تھیں اور مکرم بابو محمدؐ شریف صاحب مرحوم (ٹی۔ ٹی۔ ریلوے) آف بٹالہ ثم قادیان کی بیٹی تھیں او رمحترم مولوی عبدالرحمٰن صاحب، فاضل سابق امیر جماعت احمدیہ قادیان ان کے خالو تھے۔ بہت صابر، دیندار اور مستقل مزاج خاتون تھیں۔ تقریباً تمام بچوں کو قرآن مجید حمیدہ سلطانہ صاحبہ نے ہی پڑھایا تھا۔ دین کی چاٹ اور محبت ان میں اجاگر کی گئی تھی۔ وہ ایک تعلیم یافتہ گھرانہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ امامِ وقت حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے ارشادات پر لبیک کہنے میں ہمیشہ سبقت لے جانے کی کوشش کرتی تھیں۔ عسر و یسر میں انہوں نے ملک صاحب کی زندگی میں خدا تعالیٰ کا رنگ بھر دیا تھا اور ایسی ماں ہمیشہ اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت میں ایک امتیازی مقام پیدا کر دیتی

ہے۔اور جس اولاد کو قرآن مجید کی بیش بہا دولت ماں سے میسر آجاوے تو اس اولاد کا نصیب ہمیشہ منور رہتا ہے۔سو الحمدللہ کہ ملک صاحب کے بچے اپنی ماں کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہیں۔

ساہیوال: یہ وہی شہر ہے جہاں ایک رات ۲۶ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو سنٹرل جیل ساہیوال کی مہیب دیواروں نے انہیں اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔وہ سالہا سال دوران ملازمت پولیس کی وردی میں ملبوس انسپکٹر کی خدمات دیتے رہے اور یہ درو دیوار بڑھ بڑھ کر سلام کرتے رہے،

مگر

خدا کی راہ میں کلمہ توحید کی حفاظت میں جب وہی انسپکٹر پولیس چوکس ہوا اور آگے بڑھا تو انہیں دیواروں نے اُسے جکڑ لیا۔جبکہ خدا تعالیٰ کے فرشتوں نے اسے سلام کیا۔ بڑھاپے کی تمام منزلیں طے کر چکنے کے بعد ۷۳ سال کی عمر میں داخل ہونے والا پولیس انسپکٹر سر ہتھیلی پر رکھ کر اسی زنداں میں صبح و شام بسر کرنے لگا۔ ملک صاحب کے متعلق ان کے ایک قریبی دوست بلکہ ہم جلیس محترم الیاس منیر صاحب نے بہت واضح نقشہ کھینچا ہے۔یہ دونوں دوست سنٹرل جیل کی دیواروں کے پیچھے مصیبتوں کے سایوں میں اور آہنی سلاخوں کے درمیان دن رات بسر کرتے رہے۔قریب تر رہنے کی وجہ سے ایک دوسرے کو خوب تر جانتے تھے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ ”مضبوط جسم، سرخ و سپید چہرہ اور سفید ریش، سر پر پگڑی، سادہ لباس اور مسلسل مشقت میں مصروف ستر سالہ اس بزرگ کی تصویر ہے جس سے ۲۶ اکتوبر ۱۹۸۴ء تک ملاقات ہوا کرتی تھی۔۔۔یہ بزرگ ملک محمد دین صاحب ۲۶ اکتوبر کی صبح بھی اسی حلیہ میں بیت الحمد ساہیوال میں آئے تھے۔مگر اگلی صبح ہمارے ساتھ تھانہ اے ڈویژن کے حوالات میں تھے۔موصوف کا انداز پسِ دیوارِ زنداں آنے کے بعد بھی وہی رہا جو آزاد ماحول میں ہوا کرتا تھا۔

سوائے پگڑی کے کیوں کہ آپ کی مجبوری تھی۔ آپ ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر تھے اور کچھ ایسے غیر معمولی طور پر اپنا عرصہ ملازمت گزارا تھا کہ ستر کے پیٹھے میں ہونے کے باوجود آپ کا جسم عمومی طور پر بہت FIT تھا، باہمت تھا۔ آپ کا قد ۵ فٹ ۱۰ انچ تھا، تیز تیز قدم اٹھاتے تھے، مضبوط جسم تھا، مضبوط ارادہ تھا، پختہ حوصلہ تھا اور مضبوط صبر تھا۔'' [1]

پیکرِ صبر و رضا: قارئین! آپ کو حیرت ہوگی کہ جب اس بزرگ شخص نے اپنی رفیقۂ حیات محترمہ حمیدہ سلطانہ کی وفات کی خبر پابند سلاسل سُنی تو وہ بزرگ گھبرائے نہیں بلکہ اپنے بچوں کو جو تنہا ماں کی جدائی اور مفارقت سے نبرد آزما ہوئے اور تمام مراحل سے باپ کے مشورہ کے بغیر گزر رہے تھے، بہت اچھے خطوط لکھے کہ ''مہمان داری کا خیال رکھنا، تعزیت کرنے والوں کو صبر و حوصلہ دینا اور خدا کی رضا پر راضی رہ کر اپنی جنت خدا کے سپرد کر آنا جبکہ میں تو کندھا دینے سے بھی مجبور ہوں۔'' اختصار کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ خط جو ایک کلمہ توحید کا شہید برموقع وفات اہلیہ صاحبہ اپنے بچوں کو لکھتے ہیں، پیش خدمت ہے۔

ملک محمدؐ دین صاحب کے حوصلہ اور غیر معمولی مظاہرۂ صبر کے متعلق محترم محمدؐ الیاس منیر صاحب لکھتے ہیں۔ ''آپ نے قید و بند کی صعوبت غیر معمولی جوانمردی کے ساتھ جھیلی، پیروں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیوں کے ساتھ آپ کے چہرے پر ایک بے قرار اور طنزیہ مسکراہٹ ہوتی۔ کبھی مشکل میں دیکھ کر ان سے ہمدردی کا اظہار کیا تو ایک ہی جواب ملا۔۔۔ نہیں کوئی بات نہیں۔ صبر و رضا کا غیر معمولی مظاہرہ آپ نے سارے ہی دورِ اسیری میں کیا۔ اپریل ۱۹۸۷ء میں آپ کی اہلیہ محترمہ ایک طویل علالت کے بعد انتقال کر گئیں تو یہ صدمہ آپ نے جس طرح برداشت کیا، وہ آپ کا ہی حصہ تھا۔ گو کہ آپ کو پیرول

---

[1] روزنامہ الفضل، ربوہ

پر رہائی بھی ہوئی تھی۔۔۔گویا تین چار گھنٹوں کی رہائی تو گویا زخموں پر نمک چھڑکنے والی بات تھی۔باتیں کرتے کرتے آنسو بہہ نکلنا تو طبعی امر تھا مگر کیا مجال کہ اس مردِ مجاہد نے کوئی غیر معمولی بے صبری یا شکوہ یا اظہار کیا ہو۔"

قارئین! یہ لمحۂ فکر ہے کہ ایک ریٹائرڈ پولیس انسکپٹر سنٹرل جیل میں جب ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں پہنے سالہا سال گزار دیتا ہے تو محبتِ الٰہی میں فنا ہو جانے کا ایک ایسا ثبوت ہے کہ جو عام شخص ہرگز پیش نہیں کر سکتا سوائے اس شخص کے کہ جسے خدا کی ہستی پر کامل یقین ہو اور اس کا یقین بھی اعلیٰ درجہ تک پہنچ چکا ہو۔سو یاد رہے کہ "آپ پر اللہ کی بے شمار رحمتیں اور فضل نازل ہوں۔۔راہِ مولیٰ میں ۲ دن کم پورے سات سال اسیری کا رتبہ پایا اور اسی حالت میں اپنے مولیٰ کے حضور حاضر ہو گئے۔آپ کے لئے تو ہماری دعائیں دراصل ہمارے لئے حصولِ ثواب کا ذریعہ ہیں۔وگرنہ آپ ایسے بابرکت انجام کے لئے کتنے ہی لوگ تڑپتے ہوں گے۔"

تیری درگہ میں نہیں رہتا کوئی بھی بدنصیب
شرط راہ پر صبر ہے اور ترک نام اضطرار

وابستگی خلافت: خلافت سے وابستگی بھی مومن کی ایک شناخت ہے کیونکہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے فرمایا ہے کہ "دعا کی قبولیت کے لئے یہ شرط ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آواز پر لبیک کہا جائے۔کامل اطاعت کا حق ادا نہ کرنے والے کے حق میں خلیفۂ وقت کی دعا بھی قبول نہ ہوگی۔"

محمد الیاس منیر صاحب نے بڑے مختصر اور جامع الفاظ میں اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔فرماتے ہیں "سلسلہ کے ساتھ انہیں جو تعلق تھا،اس کے لئے تو ان کا یہ سات سالہ دورِ اسیری بہت کافی شہادت ہے تاہم ان کی زندگی کے اس پہلو کے کئی اور بھی زاویے تھے۔پیارے آقا کا ذکر آتا تو آواز رقت آمیز ہو

جاتی، آنکھیں ڈبڈبا جاتیں۔شاید یہی وجہ تھی کہ پہلی عید الفطر (جون ۱۹۸۵ء) آئی تو ایک روز پہلے پیارے آقا کا خط آیا کہ:

آپ کا غم میری خوشیوں پر سایہ کئے رہے گا

بزرگانِ سلسلہ کا بڑے پیار، احترام اور عقیدت سے ذکر فرمایا کرتے تھے۔خصوصاً حضرت مولانا عبدالرحمٰن جٹ صاحب اور حضرت چوہدری محمدؐ شریف، سابق امیر، ساہیوال سے انہیں گہرا تعلق تھا۔اوران بزرگوں کے ایمان افروز واقعات سنایا کرتے تھے۔

خلیفہٗ وقت حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ بنصرہ العزیز کا ایک ملفوف گرامی منسلک ہے جو یہ نشاندہی کرتا ہے کہ پیارے آقا کو اپنے پیاروں سے کتنی محبت تھی (خط منسلک ہے)

زندہ دل شخصیت: ملک صاحب جو زردہ اور کوفتے کھانے کے شوقین تھے، دوست بھی ایسے خوش دل لوگوں کو اختیار کرتے تھے جو شگفتگی اور وفا میں ایک مثال ہوتے ہیں، مثلاً محترم ثاقب زیروی صاحب، محترم قدرت اللہ صاحب، محترم نظام الدین صاحب اور محترم ثناء اللہ صاحب۔یہ تمام احباب ملک صاحب کے دوست وغمگسار تھے۔مگر کبھی کبھی کسی خوش نصیب انسان کو اپنی بیٹی، بیٹے اور دوست بھائی کے علاوہ ایسے ایسے گواہ نصیب ہو جاتے ہیں جو اس کے ہم نوالہ ہوتے ہیں اوراس کی زندگی کے کئی پہلوؤں کو نہایت جامع رنگ میں پرکھتے ہیں اور بیان کرتے ہیں۔یہاں آج ایک ایسے ہی ہم جلیس کا ذکر مختصراً کرنا ضروری ہے جس نے ملک صاحب کو بہت قریب سے دیکھا اوران کے شب وروز اور تجربات زندگی سے فائدہ حاصل کیا۔مثلاً محترم محمدؐ الیاس منیر صاحب ابن محترم محمدؐ اسمٰعیل منیر صاحب، ایک ایسی شخصیت ہیں جو ملک صاحب کے ساتھ تھے یعنی جیل میں اتنے قریب تھے کہ کوئی فاصلہ نہیں تھا۔اس لئے وہ برابر کئی پہلوؤں کو

ہمارے سامنے رکھنے میں کامیاب ترین ہیں۔

قارئین! آپ کو یاد ہوگا کہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو ساہیوال کیس میں گرفتار ہوئے۔ خصوصی فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ جہاں عدالت نے دو افراد کو موت کی اور چار افراد کو سات سات سال قید کی سزا دی۔ بعدازاں اس فیصلے پر نظر ثانی کی گئی اور نظر ثانی کے بعد قید کی سزا پانے والوں کی سزا بڑھا کر ۲۵، ۲۵ سال قیدِ بامشقت کر دی گئی۔ محترم ملک صاحب نے سات سال اور ایک ماہ کی یہ قید خدا کی راہ میں بے حد صبر و تحمل سے گزاری اور کبھی بھی شکوہ کا لفظ زبان پر نہ لائے۔[1]

انہیں جیل کی صعوبتوں میں محترم محمدؐ الیاس منیر صاحب بھی شریک تھے اور سلاخوں کے پیچھے بیرکس میں اکٹھے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ بزرگوار محترم ملک صاحب بڑے ہی زندہ دل شخصیت کے مالک تھے، بات بات پر نہایت برمحل اور موزوں شعر پڑھ دیا کرتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے اچھی اچھی غزلوں اور معیاری شعروں کی چاٹ ہی ملک صاحب نے لگائی۔ آپ کی خوش ذوقی کی مثال اس وقت یاد آ رہی ہے کہ ۱۵ فروری ۱۹۸۶ء کو جب انہیں یہ حکم سنایا گیا کہ فوجی عدالت نے ۲۵ سال قیدِ بامشقت کی سزا دی ہے تو کہنے لگے کہ اتنی تو میری عمر بھی نہیں ہوگی۔ واہ! ملک صاحب، آپ نے اپنی بات پوری کر دی۔

علم دوستی: بیشک آپ تھے ہی ایک زندہ دل شخصیت اور علم دوست انسان کیونکہ جب ہم ملک محمدؐ دین صاحب کے شب و روز دیکھتے ہیں تو ہمیں یقین آ جاتا ہے کہ وہ شخص بے شک علم دوست تھا۔ اگرچہ وہ اتنے زیادہ پڑھے ہوئے نہیں تھے مگر آگہی اور نکھار ان میں حد درجہ تھا۔ یہ علم سے دوستی ہی تو تھی کہ انہوں نے اپنی بیٹیوں کو بھی میدانِ علم میں سبقت لے جانے کے لئے ہمیشہ کوشش جاری رکھی

---

[1] الفضل اخبار، نومبر ۱۹۹۱ء

اور وہ کامیاب بھی ہوئے۔ کیونکہ ان کی بیٹی امتہ الرفیع صاحبہ بیگم مکرم سلیم لطیف صاحب آف ننکانہ، بی۔اے۔بی۔ایڈ ہیں، جو عورتوں کے لئے ایک علمی تکمیل کی سند ہے۔ بہر حال وہ اپنی علم دوستی میں کتابوں سے بھی پیار کرتے تھے۔ خصوصاً احادیث شریف کثرت سے پڑھتے اور حوالجات کے ساتھ بات بھی کرتے تھے۔ کیونکہ انہیں رسول کریم ﷺ سے بے پناہ عشق تھا جس کے نتیجہ میں اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کی حد درجہ کوشش کرتے تھے۔

محبت الٰہی اور محبت اللہ: حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتب کا مطالعہ اکثر جاری رکھتے اور بڑے سلجھے انداز میں سامنے والے کو مطمئن کر دیتے تھے۔ ہمیشہ داعی الی اللہ کے فرائض کی ادائیگی میں فصاحت سے کام لیتے اور ایسے حوالے پیش کرتے کہ مختصر لفظوں میں اپنا مافی الضمیر ادا کر دیتے اور یہ ایک حاضر دماغ انسان کا شعار ہے۔

شہید محترم کی بیٹی امتہ الرفیع لکھتی ہیں کہ میرے ابا جان خدا تعالیٰ سے بے پناہ لگاؤ رکھتے تھے جس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ جیل کی تنگ کوٹھڑیوں میں، نہایت مشکلات میں اور اذیت ناک حالات کے باوجود آپ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائے، خدا کی رضا پر راضی رہے۔ یہ خدا سے محبت کا ہی نتیجہ تھا کہ رحمدلی، حقوق اللہ، حقوق العباد، سخاوت جیسے جذبات آپ میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ نماز، روزہ کی پابندی بھی ان کا شیوہ تھا۔ وہ ہمیشہ باجماعت نماز کا اہتمام کرتے۔ خود بھی نماز باجماعت ادا کرتے اور ہمیشہ امامت کے فرائض بھی ادا کرنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ صبح کی تلاوت ان کا معمول تھا اور تلاوت خدا کے حکم کے مطابق بہت خوش الحانی سے کرتے تھے اور جب بھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا ذکر کرتے تو فرطِ محبت سے آپ کی آنکھیں آبدیدہ ہو جاتیں تھیں۔

جیلوں میں رضائے باری کے جو گہنے پہنے بیٹھے ہیں
اک راہ خدا کے اسیروں کی، اُن معصوموں کی باتیں کر (کلام طاہر)

جانثارانِ توحید: جب ہم اپنی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں کچھ ایسے بھی شہداء ملتے ہیں جو جہاد کے لئے نکلے ہی نہیں اور راہِ حق میں شہید ہو گئے۔ کچھ جہاد پر جا کر بھی غازی بن کر لوٹ آئے۔ اگر چہ برکتیں دونوں کا مقدر ہو گئیں تاہم کچھ ایسے بھی ملتے ہیں جو اسیرانِ راہِ مولیٰ تھے اور خدا کے نام پر قربانی کے لئے برسوں انتظار اور دعائیں کرتے رہے اور بعض شہزادہ حضرت عبد الطیف شہید کی طرح بھی ہیں جن کو اختیار دیا گیا کہ وہ اس خیال سے توبہ کرلیں کہ قادیانی درحقیقت مسیح موعودؑ ہے تو انہیں رہائی دی جاسکتی ہے۔ قارئین! شہزادہ لطیف شہید کی ظاہری کیفیت پر غور کیجئے تو آپ کو حیرت ہوگی کہ اختیارِ جانثاری یا اختیارِ انکار مسیح موعودؑ کے وقت وہ شخص کس حال میں تھا۔ شہزادہ صاحب کو ایک من چوبیس سیر وزنی زنجیر نے گردن سے کمر تک جکڑا ہوا تھا جس میں ہتھکڑی بھی شامل تھی۔ آٹھ سیر وزن کی بیڑی پاؤں میں تھی۔ ناک کو چھید کر اس میں رسی ڈال کر مقتل تک لے جایا جا رہا تھا کہ پھر امیرِ کابل نے پیغام پہنچایا کہ ''اس قادیانی شخص کی تصدیق دعویٰ سے انکار کر دو تو تم اسی وقت عزت سے رہا کئے جاؤ گے۔'' مگر انہوں نے جواب دیا کہ ''یہ شخص درحقیقت مسیح موعود ہے اگرچہ میں جانتا ہوں کہ میرے اس پہلو کے اختیار کرنے میں میری جان کی خیر نہیں اور میرے اہل وعیال کی بربادی ہے، مگر اس وقت اپنے ایمان کو اپنی جان اور ہر ایک دنیوی راحت پر مقدم سمجھتا ہوں۔'' حتیٰ کہ آخری بار جب کہ شہید محترم حضرت عبد الطیف مرحوم کمر تک زمین میں گاڑ دیئے گئے ہوئے تھے تو امیر ان کے پاس خود گیا اور اس اختیاری فیصلے کو دہرایا۔ ''اگر قادیانی سے جو مسیح موعودؑ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو، انکار کر دے تو میں تجھے بچا سکتا ہوں، اب تیرا آخری وقت ہے اور یہ آخری موقع

ہے ،اپنی جان اور اپنے عیال پر رحم کر۔'' تب عبدالطیف نے جواب دیا کہ نعوذ باللہ سچائی سے کیونکر انکار ہو سکتا ہے اور جان کی کیا حقیقت ہے اور عیال و اطفال کیا چیز ہیں جن کے لئے میں ایمان کو چھوڑ دوں۔ مجھ سے ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا اور میں حق کے لئے مروں گا۔تو یہ بھی ایک شہادت تھی مگر اعلیٰ درجے کی شہادت تھی۔ وہ خدا کی راہ میں شہید ہونے والوں کے سردار تھے جسے خدا کے مامور نے اللہ سے علم پا کر فرما دیا کہ ان کے ساتھ کوئی مماثلت نہیں۔ ''دیکھو اسی بیعت کی وجہ سے وہ پتھروں سے مارے گئے۔ایک گھنٹہ تک برابر ان پر پتھر برسائے گئے حتیٰ کہ ان کا جسم پتھروں میں چھپ گیا مگر انہوں نے اُف تک نہیں کی۔'' الغرض احمدیت یعنی حقیقی اسلام میں ایسے عظیم المرتبت جانثار گزرے ہیں کہ تاریخ کے اوراق کوئی مثال پیش نہیں کر سکتے۔تاہم جماعت نمونے کی محتاج تھی۔حضرت بانی سلسلہ احمدیہ فرماتے ہیں ''شہزادہ لطیف مرحوم نے مر کر میری جماعت کو نمونہ دیا ہے اور درحقیقت میری جماعت ایک بڑے نمونے کی محتاج تھی۔'' [1]

پس ثابت ہوا کہ قربانی ہی مومن کا معراج ہے اور قربانی وہی دیتے ہیں جو یہ ایمان رکھتے ہیں کہ جان دینا زندگی بخش ہے۔وہ اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں اور بے پرواہ ہو کر میدانِ عمل میں آجاتے ہیں اور ایک دن اپنی مقصدیت پا لیتے ہیں اور اپنی بقا کا سامان کر جاتے ہیں اور ایسے نقش ثبت کرتے ہیں کہ آئندہ ان نقوش پر چلنے والا جب آگے بڑھتا ہے تو تمام راستے روشن پاتا ہے اور جانے والے کی سخاوت کا نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ مضبوط نقش چھوڑ جاتا ہے۔

یہ نقش ہی تھے جن پر ہم نے محترم ملک محمدؐ دین شہید کو بے خوف آگے بڑھتے دیکھا ہے۔وہ ان جانثاروں میں سے تھے جنہوں نے موت کی

---

[1] تذکرۃ الشہادتین، صفحہ ۵۷

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وقت معین کا انتظار کیا ہے اور کلمہٗ توحید کے نوچنے والوں کا انجام کا انتظار بھی انہیں مدِ نظر ہوا کرتا ہے۔ سو وہ دونوں طرح کے انتظار سے نبرد آزما رہتے ہیں اور وہ منتظر رہتے ہیں کہ قربانی کا اعلیٰ نمونہ پیش کریں۔ اور یہی وہ مشن تھا جس کے لئے سات سال ایک ماہ یعنی ۲۶ اکتوبر ۱۹۸۴ء سے لے کر ۲۴ نومبر ۱۹۹۱ء تک وہ پسِ زنداں ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کے سائے میں خدا کے حضور سرنگوں رہے۔ پھر ایک دن خدا خود آیا اور اس نے ۸۸۔۸۔۱۷ کو دنیا کو ایک حشر کا نظارہ پیش کر دیا۔ دنیا محوِ حیرت رہ گئی اور یہ فلم جو صرف FIRE کی تھی، فضا میں رونما ہوئی اور پھر آج ۸۸۔۸۔۱۷ کو ہر آنکھ نے توحید کو نوچ پھینکنے والے ہاتھ کا انجام جان لیا۔ پھر مشیت ایزدی ۹۱۔۱۲۔۲۶ کو خدا تعالیٰ نے روکنے والے کا ہاتھ خود تھام کر اسے شہداء کے گروہ میں شامل کر دیا۔ تو یہ ہوتا ہے انجام خدا سے محبت کرنے والوں کا کہ وہ سالہا سال اپنے خدائے قادر کے نام پر صبح و مسا کرتے ہیں اور ہر گھڑی ان کا دل مچلتا ہے اور ہر آہٹ بزبان حال کہہ رہی ہوتی ہے لاتحزن ان اللّٰہ معنا اور اسی صدائے مولیٰ کریم پر وہ سہارا لگائے بیٹھے ہوتے ہیں اور حق الیقین کی منزل پر پہنچ کر ہمیشہ کی زندگی پا لیتے ہیں۔ پھر ان کی عید آ جاتی ہے۔ کلمہٗ توحید نوچنے والے ہاتھ کا انجام بھی دنیا نے دیکھا اور نوچنے سے روکنے والے ہاتھ کے لئے رب العزت کا بخشا ہوا انعام بھی دیکھا۔

حضرت مصلح موعودؓ لکھتے ہیں کہ لوگوں کی تو سال میں ایک عید ہوتی ہے لیکن حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی جماعت میں داخل ہو کر تمہارے لئے ہر روز عید ہے۔ پس خوش ہو جاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں قربانی کے لئے چنا ہے۔ اس لئے ان مصیبتوں، تکلیفوں، اذیتوں اور آفات کی قدر کرو کہ یہ رتبہ بڑھانے والی چیزیں ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو ماننے والے وہ ایک دعا گو وجود بھی تھے اور پابندِ سلاسل رہنے کی وجہ سے زیادہ تر اپنی توجہ دعاؤں پر مرکوز کر چکے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ بڑھاپے کی تمام منازل طے کرنے کے بعد انہیں خدا کا بلاوہ آئے تو وہ دریں اثنا جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہ ہوں۔ یہ خوف قوت پرواز کے لئے دعا کا باعث بنا۔ وہ یہی دعا کہ مولیٰ، **مجھے اب طاقت پرواز دے اور پرِ پرواز دے کر پیار سے آواز دے۔**

وہ اکثر کہتے کہ۔۔۔ میرے خدا سنٹرل جیل کی چار دیواری میں مجھے تیرا بلاوہ انعام نہیں لگتا۔۔۔ چنانچہ خدا کی قدرت دیکھئے کہ کس طرح خدا تعالیٰ دعا قبول فرماتا ہے۔

امتہ الرفیع صاحبہ اس کے متعلق لکھتی ہیں ''۱۹۸۴ء میں جب آپ کو الیاس منیر صاحب مربی سلسلہ احمدیہ اور دیگر ساتھیوں کے ساتھ جیل کاٹنا پڑی تو اس وقت آپ کی عمر اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ تھی یعنی ۷۳ برس۔ چونکہ آپ کو عمر قید ہوئی تھی، اس لئے اس بات کا بہت خوف تھا کہ آپ کی موت جیل میں نہ ہو جائے۔ آپ اکثر یہ دعا کرتے تھے کہ خدایا مجھے جیل میں موت نہ دینا۔ چنانچہ بیماری کی وجہ سے سول ہسپتال ساہیوال میں منتقل کر دیا گیا جہاں آپ کا ہرنیا کا آپریشن ہوا اور کامیاب ہو گیا۔ تین چار دن بے ہوشی طاری رہنے کے بعد پھر آپ کو ہوش آیا اور آپ روبصحت ہو گئے کہ اچانک ہارٹ اٹیک ہوا جس کی وجہ سے ۲۴ گھنٹے کے اندر ہی آپ کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت آپ کے پاس دو بیٹیاں اور ایک بیٹا بھی موجود تھے۔ اس طرح خدا نے آپ کی دعا سنی اور جیل میں ہونے کے باوجود آپ کا انتقال جیل سے باہر ہوا۔

غیر ممکن کو یہ ممکن میں بدل دیتی ہے
اے میرے فلسفیو، زور دعا دیکھو تو

میرے محبوبوں پر صبح و مسا
پڑتی ہے کیسی کیسی بلا
میری روح پہ برسوں بیت گئے
ان اندیشوں کا سایہ ہے

اک نظر میں

نام	:	ملک محمدؒ دین صاحب
والدِ محترم	:	ملک فقیر محمدؒ صاحب
جائے پیدائش	:	گورداسپور، تھ غلام نبی
عمر	:	۸۰ سال
تعلیم	:	میٹرک
جائے شہادت	:	ساہیوال (جیل سے ہسپتال)
تاریخ شہادت	:	۲۴ نومبر ۱۹۹۱ء
لباس	:	شلوار قمیص، سر پر پگڑی
قد و قامت	:	پانچ فٹ دس انچ
لواحقین	:	۲ بیٹے اور ۴ بیٹیاں
عہدہ بوقت شہادت	:	
آلۂ قتل	:	ہسپتال میں ہارٹ اٹیک
نمازِ جنازہ	:	مربی صاحب، ساہیوال
آخری آرامگاہ	:	
شمائل	:	علم دوست، خوش مزاج، ہمدرد، اطاعت شعار، دعا گو اور تہجد گزار تھے، مربیانہ طبیعت کے مالک تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم

هوالناصر، خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

وسیم احمدؐ بٹ شہید

آقا تمہارے باغ میں داخل ہوئے عدو
گلزارِ احمدی کے نہالوں کو لے گئے

آج لکھنے کے لئے جب میں نے قلم اٹھایا تو اس سوچ میں پڑ گئی کہ الٰہی یہ کیسی عظیم جماعت ہے کہ جس کے بچے بچے اپنا سر سوغات میں پیش کر کے زبانِ حال سے کہتے ہیں۔ ''فُزتُ بِربِّ الکَعبَۃِ'' یعنی رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔ اور دوسری طرف یہ لوگ کون ہیں؟ جو کونپل کو نوچ کھسوٹ کر پھینک رہے ہیں اور پاؤں تلے مسل رہے ہیں کہ جڑ کمزور ہو جائے۔ کاش وہ یہ جان لیں کہ درخت تو تراشنے سے ہی پھلتا پھولتا ہے اور احمدیت ایک ایسا تناور درخت ہے کہ جس کی جڑیں اگر زمین میں ہیں تو کونپلیں آسمان میں ہیں۔ یہ ضرور پھوٹے گا، پھلے گا اور بڑھے گا۔ یہ خدا تعالیٰ کے ہاتھ کا لگایا ہوا پودا ہے۔ کوئی انسانی طاقت اس کو نوچ کھسوٹ نہیں سکتی۔ ہر کونپل کی جگہ دس کونپلیں نمودار ہوں گی اور درختِ احمدیت کو مضبوط اور عظیم تر کر دیں گی۔ دشمن نے ۱۹۹۴ء کے ایک ہی دن ان نونہالانِ جماعت کو جنت کی مسافرت کے لئے تیار کیا ہے۔

آیئے ملتے ہیں ان بچوں سے جن کے دادا نے پھل لگایا اور پوتوں نے

کھایا۔ یہ جنت الفردوس کی راہوں کے ہمسفر ہیں اور ان خوش نصیب مسافروں کے دادا کا نام محترم غلام محمد بٹ ہے۔ خوش قسمت غلام محمدؐ بٹ صاحب ۱۹۳۳ء میں حضرت خلیفۃ المسیح ثانیؓ کے دستِ مبارک پر بیعت کر کے شاملِ احمدیت ہوئے تھے۔ اینٹی احمدیہ تحریک کا زمانہ تھا جو انتہائی مخالفت کا دور دورہ تھا۔ لیکن محترم غلام محمدؐ بٹ صاحب اس مخالفت کی آندھیوں سے ٹکراتے رہے، اپنے ایمان کی پختگی کے لئے دشمن کے سامنے صداقت کے علمبردار بن کر نمودار ہوئے۔ کمال تو یہ ہے کہ وہ قادیان کے ایک نواحی گاؤں میں رہتے تھے جہاں ان کے اپنے ہی ہمسایہ لوگ ہمیشہ مخالفت کی بھٹی گرم رکھتے تھے۔ اُدھر غلام محمد بٹ صاحب ہمیشہ سینہ سپر رہتے تھے

اور

یہ ٹھیک ہے کہ کبھی کبھی بزرگوں کا لگایا ہوا بیج پوتے کھایا کرتے ہیں۔ سو ایسے غلام محمد بٹ صاحب آپ کو مبارک ہو کہ آپ کے پوتے محترم وسیم احمد بٹ اور حفیظ احمد بٹ نے آپ کے لگائے ہوئے پھل کھائے اور ایسی عمدگی سے صبر و ہمت سے پھل آور ہوئے کہ اس کی مٹھاس اور چاشنی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت پر مہر ثبت کر گئی ہے اور وہ آئندہ آنے والی نسلوں کو قربانی کا پیغام دے گئے ہیں۔ خدا کرے کہ آپ کی نسل در نسل ان شاہراہوں پر گامزن رہے اور اس عظیم قربانی سے ہر آنے والا راہنمائی حاصل کر سکے۔ آمین۔

احمدیت کا مٹانا نہیں آساں ہر گز
جس کے خادم مجھے ابرار نظر آتے ہیں

پیدائشی احمدی: عزیزم وسیم احمد بٹ ۱۹۶۹ء میں محترم محمد رمضان صاحب کے گھر فیصل آباد محلہ سمن آباد میں پیدا ہوئے۔ اس کنبہ کے سترہ افراد تھے جو ۸ بیٹے اور تین بیٹیاں، ایک دادا، دادی اور میاں بیوی پر مشتمل تھا اور مکان نمبر

P-693 بلاک 13 میں رہائش پذیر تھا۔ ان کا ذاتی کام پاورلومز آپریٹ کرنے کا تھا۔ اگرچہ محترم محمد رمضان بٹ صاحب ۲۶ سال سے بوجہ بیماری تقریباً فارغ ہی ہیں تاہم اپنے خاندان کی نگہداشت میں اور تعلیم وتربیت میں مصروف کار تھے کہ ۱۹۵۳ء میں ان کی مخالفت غیراز جماعت لوگوں سے شروع ہوگئی۔

قارئین! آپ کو یاد ہوگا کہ قادیان کے نواحی گاؤں میں جو خاندان ان کا جنون کی حد تک دشمن تھا، وہ اتفاقاً لائل پور یعنی فیصل آباد میں اسی محلہ میں آکر آباد ہوگیا۔ یعنی تقسیم ہند سے پہلے والے مخالف فریق کا ساتھ تقسیم ہند کے بعد بھی جاری رہا مگر دشمنی کی شکل میں اور عداوت کی صورت میں جنوں کی حدوں کو پار کر گیا جس کی وضاحت یہاں اگر ۱۹۵۳ء کی صورت حال اور ملک کی گھمبیر مخالفت کا نقشہ دیکھا جاوے تو وضاحت وتفصیل سے بات سامنے آجائے گی کیونکہ مذہبی جنونیوں اور مولیوں نے طاقت پکڑ لی ہے اور غنڈے بھی میدان میں کود پڑے ہیں۔ اور مسجدوں کو نذر آتش کرنا ہی تبلیغ اسلام کا ایک جزو سمجھا گیا ہے جو محض اس لئے تعمیر کی گئی تھیں کہ ان میں خدائے واحد ویگانہ کی پرستش کی جائے۔

لیکن جب

علماء ہی یہ درس دیتے ہوں کہ خدمت اسلام کا بہترین ذریعہ لُوٹ مار اور قتل و غارت ہے تو عوام الناس ثواب کمانے کے لئے ایسے منفرد مواقع کب ہاتھ سے جانے دیتے ہیں۔ ایسی خدمت کا موقع بھلا روز روز کہاں میسر آتا ہے کہ دنیا بھی سنور جائے اور عاقبت بھی، چنانچہ گھر بار جلنے لگے، لوٹ مار کا بازار گرم ہوا اور ایک دن لائل پور میں دس ہزار (۱۰۰۰۰) کے ایک ہجوم نے ضلع کچہریوں پر حملہ کر دیا، کھڑکیاں توڑ ڈالیں، مجسٹریٹوں کو عدالتیں بند کرنے پر مجبور کر دیا۔ پھر ڈپٹی کمشنر کے گھر میں گھس گئے۔ لائل پور کاٹن ملز کی ایک خوردہ فروش کی دوکان لوٹ لی گئی۔ خدا جانے ان کے کتنے معصوم بچوں نے بھوک سے بلک بلک کر وہ رات

گزاری ہوگی۔ کیا یہ سب کچھ خدا کی خوشنودی کی خاطر کیا گیا؟ [1]

خیر یہ ہنگامے وہ تھے جو تبلیغ اسلام کے نام اور خوشنودیٔ مولیٰ کے لئے اٹھائے گئے تھے مگر اب تو قتلِ مرتد کی تبلیغ آ گئی ہے، دیکھتے ہیں یہ خون کیوں بہایا جا رہا ہے؟

دراصل یہ مذہب کے نام پر خون ہی تو ہے جو سرزمین پاکستان کے چپہ چپہ پر بہایا جا رہا ہے اور خون بہانے والا وہ ہاتھ ہے جس کا مذہب کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں۔ وہ لوگ تو یہ تک نہیں جانتے کہ مذہب کے لفظی معنی کیا ہیں۔ چند مذہبی علماء اس ظلم کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔توہینِ رسالت جیسے شاخسانے لے کر وہ نکلتے ہیں اور اپنی متشدّد طبیعت کی بناء پر بلا امتیاز عمر و قوم وہ جانیں طلب کر کے دوزخ خرید لیتے ہیں۔میرے ملک میں مذہب کے ٹھیکیداروں نے یہی تو ٹھیکہ لے رکھا ہے۔جو آچانک کسی نہ کسی رنگ میں کسی نہ کسی شہر میں آپ کو نظر آتا ہے کیونکہ میرے ملک کا عالم اس تراش خراش کے عمل میں حد درجہ ماہر ہے۔خدا معاف فرمائے۔

۳۰ اگست ۱۹۹۴ء کو آج یہ مہارت اور خدمت اسلام وسیم احمد بٹ شہید کی قربانی لے کر پیش کی گئی ہے۔اس کے متعلق محترم ایم۔طاہر بٹ صاحب، انسپکٹر انصار اللہ لکھتے ہیں کہ:

''۳۰ اگست ۱۹۹۴ء کی دوپہر کو جب سارے آسمان کو کالے بادلوں نے اور گلیوں بازاروں کو تیز تند ہواؤں نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، تو وسیم احمد بٹ شہید کام سے دوپہر کے کھانے کے لئے گھر آ رہے تھے تو راستے میں قاتلوں نے آپ پر فائرنگ کی۔ فائر آپ کی کلائی پر لگا۔آپ بھاگتے ہوئے اندر گئے اور پستول اٹھایا اور واپس آ کر فائرنگ شروع کر دی۔مگر شاید تقدیر کو یہ منظور نہ تھا،

---

[1] مذہب کے نام پر خون، صفحہ ۱۸۵

پسٹل نہ چلا۔آپ نے اسے پھینک دیا۔اسی اثناء میں تین دشمنوں نے آپ پر کلاشنکوف کا برسٹ مارا۔دوسری گولیوں کے علاوہ ایک گولی آپ کے دل پر لگ گئی مگر آپ گرے نہیں اور گرتے گرتے ایک دشمن تک جا پہنچے اور اس کی گن چھین کر ابھی ایک فائر ہی کر پائے تھے کہ گر پڑے اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔"

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

تو یہ دل پر گولی کھانے والا وسیم احمد بٹ شہادت کے میدان میں نہ صرف انعام یافتہ قرار پایا بلکہ شجاع و بہادر نوجوان جو احمدیت کا سچا سپوت تھا، جس کی ہمت خدا نے باندھی تھی اور فرشتے اس کے بازو بن کر دشمن پر لپکے تھے، اپنی جوانمردی اور بہادری کا زندہ ثبوت بن گیا۔

آج ۳۰ اگست ۱۹۹۴ء بوقت نماز عصر احمدیت کے سپوت نے ثابت کر دیا کہ قربانی جب راہِ مولیٰ میں دی جاتی ہے تو احمدیت میں ایک نیا رنگ بھر دیتی ہے۔ ہر دوسرا احمدی انہی نقش پا پر چلنے کے لئے آگے بڑھتا ہے اور خلاء کو پیدا ہی نہیں ہونے دیتا بلکہ پہلے شہید سے واضح، اعلیٰ اور صاف سوغات لے کر خدا کی درگاہ میں حاضر ہو جاتا ہے کیونکہ وہ عاشق صادق ہوتا ہے۔اے وسیم بٹ! آپ جیسے بہتوں نے بھی ہر سرخ دور کے وقت قربانی کے لئے اپنا پاکیزہ اور تازہ خون سرزمینِ پاکستان میں پیش کیا ہے کیونکہ آج اسی خاندان کے پانچ افراد یکے بعد دیگرے اس اسماعیلی قربانی کی نذر ہو گئے ہیں۔پس اے خاندان بٹ غلام محمد صاحب مرحوم و مغفور، آپ کو مبارک ہو کہ آپ کے پانچ پوتوں نے ہر خطرے سے بے پرواہ ہو کر اور ہر خوف کو دل سے نکال کر احمدیت یعنی حقیقی اسلام کا جھنڈا بلند کر دیا ہے اور آپ کو امتیازی شان کا مالک بنا دیا ہے، آپ کو صد مبارک ہو۔یہ خدا کی بے نیازی ہے کہ اس نے تین پوتوں کو غازی بنا کر لوٹا دیا اور دو کو اپنے انعام یافتہ زمرے میں شامل فرما لیا ہے۔

قارئین کرام! اس موقعہ پر جب ایک ایسے خاندان کے افراد جو تاجر طبقہ تھا، فوجی اور جنگجو طبقہ نہیں تھا، نے بخوشی راہِ خدا میں قربانی پیش کی ہو، کچھ تو شہید ہوئے اور ہمیشہ کے لئے زندہ ہو گئے اور کچھ زخمی ہو کر اپنے پیارے خدا کی آغوش میں پناہ گزیں ہوئے۔ جذبات محبت وعقیدت پیش کرنا ہم پر لازم ہو گیا بلکہ ہم پر یہ بھی لازم ہو گیا کہ دیکھا جاوے کہ یہ کس کا عشق ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے اور ہر احمدی کلمہ گو اپنا سر کیوں ہتھیلی پر لئے پھرتا ہے؟ تو واضح ہو کہ سب سے پیارا وجود خدا تعالیٰ کی ذات ہے اور سب سے سچی محبت سرور کائنات محمد ﷺ کی محبت ہے جس کو پانے کے لئے ہر احمدی جان کی بازی بھی ہار دیتا ہے، بیشک اے احمدی نوجوان!! یہ قربانی ہی تو تجھے اس مقام پر لے جاتی ہے جو خدا کا ملاقی بنا دیتا ہے۔

قربانی ہے کیا؟ قربانی قرب پر دلالت کرتی ہے اور ذبح ہونے پر بھی۔ یعنی ذبح ہو کر اپنی جان خدا تعالیٰ کے راستے میں دے کر انسان بظاہر اپنے عزیزوں سے جدا ہو جاتا ہے مگر یہ قربانی ایک ایسی چیز ہے کہ وہ جدائی میں بھی وصال کے سامان پیدا کر دیتی ہے۔۔۔۔ حقیقتاً وہ اپنے پیاروں کے قریب ہو رہا ہوتا ہے کیونکہ سب سے پیارا وجود تو خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ پس جو شخص خدا تعالیٰ کے لئے جان دیتا ہے، وہ اپنے خدا کے قریب ہو جاتا ہے اور جب جو شخص اپنے خالق و مالک اور خدا ہی کو پا لے تو غم کس بات کا؟ اس کی تو آخرت سنور گئی۔ کیونکہ خدا کی راہیں اسے میسر آ گئیں۔ پس جان کی قربانی پیش کرنے سے انسان ایک عظیم ترین انعام کا مستحق ہو جاتا ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز کر دیتا ہے بلکہ اس کا تمام خاندان بھی امتیازی شان کا مالک بن جاتا ہے اور یہ خدا تعالیٰ کا خاص فضل ہوتا ہے کہ وہ کسی خاندان کے فرد کو چُن لے۔

قربانی راہِ مولیٰ: قارئین! یاد رہے کہ قربانی راہِ مولیٰ کسی کی ذاتی سعی یا

کوشش کا نتیجہ نہیں ہو [illegible] کے فضل اور انعام کے نتیجہ میں شہادت نصیب ہوتی ہے۔ اگر قربانی اور شہادت [illegible]شش کے نتیجے میں مل سکتی تو حضرت خالد بن ولیدؓ چارپائی پر روتے ہوئے [illegible] برتے ہوئے صحابہ کرامؓ کو یہ باور نہ کراتے کہ وہ بے شمار جنگوں میں جذبہ شہادت لے کر گئے تھے اور غازی بن کر ہمیشہ لوٹے تھے، ان کے جسم پر ۷۰ تلوار نیزے کے نشانات تھے مگر مقدر میں چارپائی پر ہی وفات لکھی ہوئی تھی کیونکہ شہادت ایک ایسا انعام الٰہی ہے جو کسی انسان کی ذاتی سعی کے نتیجہ میں نصیب نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ یہ قربانی معراج ہوتا ہے ایمان بالغیب کا اور ایمان ہی یہ جذبہ پیدا کرتا ہے۔

پس وسیم شہید کی شہادت بھی کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا بلکہ غلام محمدؐ بٹ صاحب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی المصلح موعودؓ کے دور میں بھی ان آزمائشوں کی گھڑیوں سے دوچار ہوتے تھے۔ مخالفت و مصائب کے شکنجے میں کئی بار انہی لوگوں کے ہاتھوں سے آزمائے گئے تھے۔ مگر ہمیشہ اپنے پختہ ایمان کی وجہ سے سرخرو نکل جاتے تھے اور دشمن ناکام و نامراد انتقام کے جذبہ سے جلتا رہتا تھا، اور جلتا ہی چلا گیا اور جلتا ہی چلا جائے گا۔

اس جہاں کو چھوڑنا ہے تیرے دیوانوں کا کام
نقد پا لیتے وہ اور دوسرے امیدوار

لیکن بٹ خاندان کے چشم و چراغ جب روشن ہوئے تو انہوں نے اپنے خون سے آبیاری کی اور خدا کا دامن تھام لیا کیونکہ وہ حوادث میں پلے تھے اور ۱۹۷۴ء کے حالات نے بٹ خاندان کو مخالفت کی لپیٹ میں لے لیا تھا مگر یہی تمام حالات مزید تقویت کا باعث ہوتے رہے۔

ایک موتی کی طرح بطن صدف میں ثاقب
ہم نے سیکھا ہے حوادث میں ہی پلتے رہنا

اور پھر ایک دن ڈاکٹر مظفرا [illegible] شہادت پر امامِ وقت
حضور خلیفۃ المسیح الرابع مدظلہٗ اللہ تعا [illegible] واز بلند ہوئی کہ:

''اس راستے سے [illegible] بھی پیچھے نہ ہٹو جس پر
چلتے ہوئے وہ مردِ صادق بہت آگے بڑھ گیا''

حقیقت میں خلیفۂ وقت کی آواز اتنی اثر انداز ہوتی ہے کہ چھوٹی چھوٹی جانیں اور آنے والی نسلیں بھی اس کے لئے ہمہ تن گوش ہوتی ہیں اور پیچھے نہیں ہٹتیں،

اور جب

''پیچھے نہ ہٹو'' کی آواز فضا میں گونجی اور نسلوں میں ارتعاش پیدا کر گئی تو ہر آنے والا تیار ہے اور کمر ہمت باندھے کھڑا ہے۔ اور یہ ارشاد مبارک اس کا جزو ایمان ہے کہ ''اے اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے دروازے سے داخل ہونے والو! اے اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے دروازے سے داخل ہونے والو! تمہاری زندگی کے سفر میں لازماً صالحیت سے بالاتر مقام بھی آنے والے ہیں۔ خوب یاد رکھو کہ یہ راستہ خوف و ہراس اور نقصان وضیاع کا راستہ ہرگز نہیں بلکہ لامتناہی انعام پانے کا سلسلہ ہائے ہے جس کے انعام کی ہر منزل بلند تر ہے۔''

چنانچہ انعام پانے کا لامتناہی سلسلہ جب بٹ فیملی میں شروع ہوا تو خدا کا لگایا ہوا پودا تناور درخت بنا۔ پھل لایا، پھلا اور پھولا اور میٹھے پھلوں سے لد گیا اور پھر ایک دن زندگی کے سفر میں صالحیت سے بالاتر مقام آیا۔ ایک نہیں، دو نہیں، تین نہیں، چار نہیں بلکہ پانچ پوتوں نے دادا جان کا لگایا ہوا پھل کھایا اور تبلیغ اسلام کی وہ لَو جو حالات و آفات اور وقت نے کم کی تھی، نوجوان پوتوں نے اپنے لہو سے ابھار دی اور آج ہزارہا احمدی بیٹوں میں جل رہی ہے، اس کو بجھنے نہیں

دینا، اس کو بجھنے نہیں دینا۔

وسیم احمد شہید کے محبوب خلیفہ کا پیغام آج بھی محترم نسیم احمد بٹ، اختر کریم، خالد پرویز بٹ، نعیم احمد بٹ، امین احمد بٹ، نسیم کوثر، پروین کوثر، نعیم کوثر، تسلیم احمد بٹ، شاہد پرویز بٹ کے نام روح کی غذا بن کر جسم میں صبح و شام دوڑ رہا ہے۔ وہ لبیک یا سیدی کہنے والے لوگ بن کر ابھریں گے۔ انشاء اللہ۔ اگرچہ اذنِ ربی دو پوتوں کے نصیب روشن کر گئی اور باقی پوتے امین بٹ صاحب اور اختر کریم بٹ صاحب کو خدا تعالیٰ نے صحت دی اور خدا کے بندوں کی خدمت کے لئے توفیق عطا کی۔

"دوہرے قتل کے مجرموں کو دو دو مرتبہ سزائے موت": ملزموں نے فیصل آباد کے تھانہ فیکٹری ایریا میں معمولی تنازعہ پر وسیم اور حفیظ کو قتل کر دیا۔ (روزنامہ پاکستان، لاہور)

فیصل آباد بیورو رپورٹ: انسدادِ دہشت گردی کی خصوصی عدالت کے جج حسن علوی نے تھانہ فیکٹری ایریا کے دوہرے قتل کے مشہور مقدمہ کا فیصلہ سناتے ہوئے دو ملزموں مشتاق احمد اور اشفاق احمد کو دو دو مرتبہ سزائے موت اور مجموعی طور پر ۲۷ سال قید کی سزا کا حکم سنایا ہے جب کہ اس مقدمے کے ایک اور ملزم اخلاق احمد کو مجموعی طور پر ۱۳ سال قید اور چار لاکھ روپے پچاس ہزار روپے دعیت ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تین ملزموں فرید، طاہر، ناصر کو شک دے کر بری کر دیا گیا۔ اسی مقدمے کا ملزم آفتاب احمد مقدمے کی سماعت کے درمیان فوت ہو چکا ہے۔ استغاثہ کے مطابق ملزموں نے ۳۰ اگست ۱۹۹۴ء کو کھیلنے کے دوران جھگڑا پر فائرنگ کر کے دو افراد وسیم عرف باؤ اور حفیظ احمد کو ہلاک کر دیا جب کہ اختر اور امین کو شدید زخمی کر دیا تھا۔

تو یہ تھی رپورٹ جو اخبار نے ۲۷ اگست ۱۹۹۹ء کو عوام کو دی مگر اس کے

پیچھے جو عوامل تھے، وہ تقریباً ۱۰۰ سال سے کارفرما تھے، اور آگ تھی جو سلگ رہی تھی اور بالآخر کھیل کھیل میں زندگیوں سے کھیل گئے۔ کیونکہ وہ جنت کے امیدوار ہیں اور احمدی کی جان لینے سے جنت کی کنجی ان کا مقدر بن جاتی ہے، یہ ہے اصل میں علماء حضرات کی شعلہ بیانی جو مختلف شکلوں میں مختلف جگہوں پر اور مختلف اشخاص پر طبع آزمائی کرتی رہتی ہے مگر یاد رہے کہ صرف نصیب والے منعم علیہ گروہ میں شامل ہوتے ہیں۔

واقعۂ قربانی:

وہی فلک پر چمکتے ہیں بن کے شمس و قمر
جو در پہ یار کے عمریں گزار دیتے ہیں

سیدنا خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے مختصر اور جامع لفظوں میں اس شہید وسیم صاحب کے واقعۂ قربانی کا ذکر فرمایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "۳۰ اگست ۱۹۹۴ء کو ایک شخص مشتاق اور اس کے ساتھی حملہ آوروں نے آپ پر اور آپ کے بھائیوں پر رائفلوں سے گولیاں برسائیں جن میں ایک گولی آپ کے دل پر اور دوسری گولی ٹانگ پر لگی اور آپ موقع پر ہی قربان ہو گئے"۔ بوقت قربانی آپ کی عمر ۲۵ سال تھے، آپ غیر شادی شدہ تھے۔

اس حملہ میں آپ کے بھائی محمد امین بٹ اور دو چچا زاد بھائی حفیظ احمد اور اختر کریم صاحب بٹ بھی شدید زخمی ہوئے۔

وسیم احمد بٹ بہت کم گو تھے لیکن ایک بات عموماً کہتے تھے۔ "پتہ نہیں کب بلاوا آ جائے۔" یہ جملہ اکثر ان کے لواحقین، عزیز واقارب اور دوستوں نے دہراتے ہوئے سنا تھا۔ یعنی شہید کی طبیعت میں ایک سنجیدہ اور اداس عنصر ضرور تھا۔ ان کی شادی ابھی نہیں ہوئی تھی مگر دوستی و محبت اپنے پیارے بزرگوں سے، گھر والوں سے بہت خصوصیت سے کرتے تھے۔ مثلاً جب بھی کام سے واپس

آتے تو کوئی پھل یا چیز کھانے کی ضرور لاتے۔خالی ہاتھ کبھی نہیں آتے تھے۔چھوٹے بہن بھائیوں کے علاوہ بڑوں کی تکریم وعزت برقرار رکھتے تھے۔

نماز باقاعدہ پڑھتے تھے اور تلاوت قرآن مجید بھی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔گو وہ باجماعت نماز ادا نہیں کرتے تھے مگر وقت پر اپنی مصروف زندگی میں سنوار کر خدا کے حضور حاضر ہو جایا کرتے تھے اور جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے تو وہ جانتے تھے کہ میرے محبوب آقا محمد مصطفی ﷺ کے ارشاد کے مطابق غریبوں کا چارہ ساز ہونا بھی ایک عظمت کی دلیل ہے۔وسیم احمد بٹ صاحب ہمیشہ رحمدلی سے لوگوں سے پیش آتے اور ہمدردی میں عموماً اپنے نئے کپڑے بھی انہیں دے آتے۔بعض اوقات وہ لباس بھی غریبوں میں بانٹ دیتے تھے جسے بڑے شوق سے ان کے گھر والوں نے ان کے لئے بنوایا ہوتا تھا۔

خطبہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز: ''مکرم وسیم احمد بٹ ۱۹۶۹ء میں مکرم محمد رمضان بٹ صاحب کے ہاں پیدا ہوئے اور مڈل تک تعلیم حاصل کی۔اور پھر پاور لومز میں کام کرنے لگے۔جماعت سے بہت لگاؤ رکھتے تھے اور دعوت الی اللہ میں خوب حصہ لیتے تھے۔نماز باقاعدگی سے ادا کرتے تھے اور چندہ میں بہت باقاعدہ تھے۔غریب پرور تھے۔''

ہے زندہ قوم وہ نہ جس میں ضعف کا نشان ملے
کہ طفل طفل ،پیر پیر جس کا نوجوان ملے

تو آیئے آج ہم ان بچوں سے ملتے ہیں جو جنت کی راہوں کے ہمسفر ہیں۔آج تو ہمارے ساتھ خلیفہ وقت امام جماعت کی گواہی بھی پیش پیش ہے۔فرماتے ہیں کہ وسیم احمد بٹ غریب پرور تھے۔بیشک وہ اکثر اپنے پارچہ جات، جوتے وغیرہ غریبوں میں بانٹ دیتے تھے۔خصوصاً عید کے موقع پر لے جا کر خاموشی سے غرباء کو دے کر آ جاتے تھے۔مزاج بھی غریبانہ تھا۔اسی لئے

دوسروں کی حاجت روائی میں پیش پیش ہوتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ غیر از جماعت لوگوں نے ان کے جنازہ میں ہر جگہ ساتھ ساتھ رہ کر ثابت کر دیا کہ غریبوں کا دوست آج بھی زندہ ہے۔

دائمی زندگی: ۳۰ اگست ۱۹۹۴ء کو خدا تعالیٰ نے انہیں دائمی زندگی عطا کر دی۔ہوا ایسے کہ وہ لوگ جو ۵۰ سال سے یعنی نصف صدی سے مخالفت کی آگ میں جل رہے تھے اور موقع کی تلاش میں تھے۔آج بٹ فیملی کو سرخرو کر گئے اور اپنے لئے دوزخ خرید گئے۔کچھ دوستوں کے ساتھ مشتاق نام کا ایک آدمی آگے بڑھا اور آپ پر اور آپ کے بھائیوں پر رائفلوں سے گولیاں برساتا ہوا چلا گیا۔آپ اپنے روزمرہ کے کام پر جا رہے تھے اور دشمن آپ کو جنت میں لے گیا۔حملہ آوروں کی گولیاں بوچھاڑ کی شکل میں آئیں اور ایک گولی آپ کے دل پر دوسری بائیں ٹانگ پر لگی۔اس لئے آپ موقع پر ہی قربان ہو گئے۔بوقت قربانی آپ کی عمر ۲۵ سال تھی اور غیر شادی شدہ تھے۔اس حملہ میں بڑے بھائی امین بٹ صاحب اور دو چچا چچازاد بھائی حفیظ احمد بٹ صاحب اور اختر کریم بٹ بھی شدید زخمی ہوئے،جن میں حفیظ بٹ صاحب الائیڈ ہسپتال پہنچ کر خدا کے حضور میں جا حاضر ہوئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون. دونوں شہداء کی تدفین ۳۱ اگست ۱۹۹۴ء کو ربوہ قبرستان عام میں ہوئی۔

میرے دل کے افق پر لاکھوں چاندستارے روشن ہیں لیکن
جو ڈوب چکے ہیں ان کی یادوں نے منظر دھندلا یا ہے

مذہب کے معاملے میں بہت جذباتی تھے: اصل میں یہ ردِ عمل تھا ان حالات کا جو وسیم بٹ کے بزرگوں کو ۱۹۳۳ء سے لے کر تا دم آخر پیش آ رہے تھے۔ویسے یہ بھی ایک مستند حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو انعامات سے نوازتا ہے تو اس میں وہ جوہر بھی پیدا کر دیتا ہے جو اسے انعام کا مستحق بنا دیتے ہیں۔یہی

حال وسیم احمد بٹ شہید کا سننے میں آتا ہے کہ انہوں نے اپنی تمام زندگی غرباء سے محبت، بچوں سے پیار، حاجت مندوں کی دیکھ بھال، بیماروں کی نگہداشت اور ہمسایوں کا دکھ محسوس کرنے میں گزار دی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی شہادت پر لوگ ،دوست، محلہ دار، تاجر برادری، خصوصاً غرباء بلک بلک کر رو رہے تھے۔

محترم ایم طاہر بٹ صاحب، انسپکٹر انصار اللہ لکھتے ہیں کہ ''آپ سماجی کاموں اور بھلائی والے کاموں کی وجہ سے علاقہ میں نہایت مشہور تھے۔ آپ کی شہادت پر غیر احمدی دوکانداروں نے ہڑتال کی، جلوس نکالے اور قاتلوں کو سخت سے سخت سزا دینے کا مطالبہ کیا۔ اور غیر از جماعت دوستوں نے علیحدہ نماز جنازہ ادا کی۔ شہید کی نماز جنازہ ۵ دفعہ ادا کی گئی۔ دو دفعہ جماعت احمدیہ نے اور دو دفعہ غیر از جماعت احباب نے اور ایک دفعہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایداللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے نماز جنازہ غائب پڑھائی اور ہم سب کے لئے ڈھارس اور جذبہ قربانی کا ایک سمندر عطا کیا۔

ہے زندہ قوم وہ نہ جس میں ضعف کا نشاں ملے
کہ طفل طفل پیر پیر جس کا نوجوان ملے

اک نظر میں

نام	:	وسیم احمد بٹ
والد محترم	:	محمد رمضان صاحب
جائے پیدائش	:	فیصل آباد، سمن آباد
تعلیم	:	مڈل
عمر	:	۱۹۶۸ء۔۱۹۹۴ء
لواحقین	:	والدین اور بہن بھائی
پیشہ	:	تجارت
مقام شہادت	:	تجارت
مقام شہادت	:	فیصل آباد
آلۂ قتل	:	پستول (رائفل)
تاریخ شہادت	:	۳۰ اگست ۱۹۹۴ء
عہدہ بروقت شہادت	:	خادم
تدفین	:	ربوہ
شمائل	:	غریب پرور تھے، اپنی ضروریات کو پس پشت ڈال دیتے تھے۔ اسلام کا سچا عاشق۔ اطاعت رسول کے دروازے میں داخل ہونے والا وسیم شہید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہٗ ونصلی علی رسول کریم

هوالناصر، خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

عزیزم حفیظ احمد بٹ شہید

گلشنِ دینِ محمدؐ کے مہکتے پھولو
لاکھ ہوں جورِ خزاں پھولتے پھلتے رہنا

عزیز حفیظ احمد بٹ کے والد محترم اللہ رکھا بٹ صاحب کثیر لاولاد ہیں اور اپنے تمام بچوں اور بیوی سمیت تقسیمِ ہند کے بعد ہجرت کر کے فیصل آباد میں ہی آباد ہو گئے ہیں۔ تقسیم ہند سے پہلے وہ قادیان کے ایک نواحی گاؤں میں رہتے تھے۔ان کے والد محترم غلام احمد بٹ صاحب نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے دستِ مبارک پر ۱۹۳۳ء میں بیعت کر کے احمدیت قبول کی تھی اور اطاعتِ امام پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔وہ یہ جانتے تھے کہ مخالفت کی وہ آندھیاں جو اینٹی احمدیہ تحریک سے اٹھی ہیں، ان کے مخالفین کو ہی جلا کر راکھ کر دیں گی۔لہٰذا وہ ہمیشہ اپنی قوتِ ایمانی کو مضبوط اور برقرار رکھتے اور مخالفین کے سامنے سینہ سپر رہتے۔ان کی اولاد نے بھی اپنے والدین سے فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَر کا سبق بخوبی ذہن نشین کر لیا ہوا تھا۔

چنانچہ

جب یہ خاندان پاکستان میں آیا تو وہ مخالفین جو کسی نہ کسی شکل میں انہیں اذیت دیا

کرتے تھے۔ اتفاقاً لائل پور کے اسی محلّہ میں آ کر آباد ہو گئے۔ ملک تو بے شک بدل گیا مگر دل و دماغ نہ بدل سکے۔ وہی اذیتیں، جلاؤ گھراؤ اور قتل و غارت غلام محمد بٹ صاحب کے خاندان کا مقدر بن گئی۔ خدا تعالیٰ جو ہمیشہ ابتلاؤں کے بعد انعامات سے نوازتا ہے مگر اس کے متعلق دشمن کیا جانے؟ خدا تعالیٰ خود آگے بڑھا اور اللہ رکھا بٹ کے خاندان کو بھی اسی طرح نواز لیا جس طرح محترم محمد رمضان بٹ کے بچوں کو منعم علیہ گروہ میں شامل کر لیا تھا۔

چنانچہ

عزیزم حفیظ احمد بٹ جو کہ اپنے والد اور بھائی بہنوں کے ساتھ مکان نمبر ۱۶/۷۔۱۵/۷، بلاک نمبر اے۔۴۶، سمن آباد میں رہائش پذیر تھا، ابھی اپنی عمر کی پختہ حدود میں داخل نہیں ہوا تھا، یعنی اٹھارہ برس کا بھی نہیں تھا کہ خدا تعالیٰ نے اسے راہِ مولیٰ میں قربانی پیش کرنے کے لئے چُن لیا۔

قارئین! یہ بات میں نے عزیزم وسیم احمد کے متعلق بھی تحریر کی ہے کہ قربانی کسی کی سعی یا کوشش کے نتیجہ میں نہیں ہوا کرتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی راہیں ایسی وسیع ہوتی ہیں کہ جان و مال پیش کرنے والوں کے لئے وہ شاہراہیں کھول دیتا ہے اور اس طرح انسان کو قربانی کے نتیجہ میں دوسروں سے ممتاز کر دیتا ہے۔ اگرچہ شہادت یا قربانی کے ساتھ متضاد جذبات پیدا ہوتے ہیں جن کا سمجھ لینا مفید ہوگا، مثلاً

”قربانی ہے ہی ایک عجیب لفظ جو کئی ایک متضاد جذبات کا جامع ہے۔ عام طور پر متضاد جذبات جمع نہیں ہوا کرتے اور جو الفاظ محبت پر دلالت کرتے ہیں، وہ ساتھ ہی راحت اور آرام پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ لیکن تکلیف اور دکھ پر دلالت نہیں کرتے اور جو الفاظ تکلیف اور دکھ کے مفہوم پر دلالت کرتے ہیں، وہ راحت اور آرام اور محبت کے مفہوم پر دلالت نہیں کرتے

مگر

قربانی ایک ایسا جامع لفظ ہے جو جدائی اور وصال، تکلیف اور راحت، خوشی اور غم، ان سارے ہی متضاد جذبات کا جامع ہے اور ان پر مشتمل ہے۔'' [1]

تو واضح ہو کہ غلام محمد بٹ کے خاندان کی قربانی جہاں جدائی اور تکلیف کے جذبات لئے ہوئے ہے، وہاں راحت اور خوشی بھی اس خاندان کا مقدر بن گئی ہے کیونکہ پرانی ۱۹۳۵ء کی دشمنی وعداوت بالآخر انعام الٰہی پر ختم ہوئی اور یہ ابتلا کا لمبا دور اس خاندان کو ۱۹۹۴ء تک درپیش رہا۔ اور خدا تعالیٰ نے امتیازی طور پر انہیں ثابت قدم رکھا۔ محترم دادا جان زبان حال سے یہ نوید سنا گئے تھے کہ

ہر حال میں رہے گی ہری شاخ مشمرم
کرے گی کیا خزاں کی ہوا دیکھتے رہو

(ڈاکٹر پرویز پروازی)

المختصر اللہ رکھا بٹ صاحب تجارتی کاروبار میں قانع تھے اور اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں مصروفِ کار تھے۔ چونکہ ماشاء اللہ آپ کثیر الاولاد تھے، اس لئے بچوں کو اپنے کاروبار یعنی پاورلومز آپریٹ کرنے میں شامل کرلیا ہوا تھا۔ اس لیے اس خاندان نے مروجہ خواندگی کے لحاظ سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ ان کا بیٹا حفیظ احمد بٹ جو ۱۹۷۶ء میں پیدا ہوا تھا، ان کی گیارہوں اولاد تھی۔ چونکہ حفیظ احمد بٹ پیدائشی احمدی تھے اس لئے مذہبی لحاظ سے انہیں اپنے عقائد سے بخوبی واقفیت تھی۔

حقوق العباد: وہ جانتے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں ہی کلمے کا نچوڑ ہیں۔ ایک کلمہ گو، گو پہلے تو اپنے خدا تعالیٰ کے حقوق ادا کرنے میں ہر نیکی کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ خصوصاً نماز کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی سرزد نہ ہو، دعا مانگتا ہے کہ

---

[1] خطباتِ محمود، جلد دوئم

ایک منظّم رنگ میں حقوق خدا ادا کرنے کی توفیق ملے۔اس عمل سے اس کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے۔وہ آہستہ آہستہ خدا کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے اور بالآخران کا حق ادا کر کے اسی کا ہو جاتا ہے۔جس طرح فَصَلِّے کے بعد وَالنحر آتا ہے اور پھر قربانی کے نتیجہ میں خدا ان کا ہو جاتا ہے۔

مگر

ہم حفیظ احمد بٹ کے شب و روز کو سامنے لائیں تو ان میں شرعی حقوق کی ادائیگی میں انہوں نے نماز کو اپنا شعار بنایا اور پابندی سے ادا کیا۔اللہ رکھا صاحب بٹ لکھتے ہیں کہ جب حفیظ احمد شہید ہوئے تو ناظم الاطفال الاحمدیہ تھے۔اور اطفال کی تربیت ان کے سپرد تھی۔چونکہ وہ خود سنوار کر نماز ادا کرتے ہیں۔اور کبھی کبھی تہجد بھی ادا کیا کرتے تھے۔لہٰذا ان کے دل میں یہ جذبہ تھا کہ میں بحیثیت ایک ناظم اطفال کے سامنے اپنا مثالی نمونہ پیش کروں گا تو ہی سچی کامیابی نصیب ہوگی۔لہٰذا وہ اس مقام کو حاصل کرنے کے لئے نماز، روزہ اور چندہ میں باقائدگی اختیار کرتے تھے۔اپنی ہمت کے مطابق اپنے بھائی بندوں میں آگے بڑھنے کی ہمیشہ کوشش کرتے تھے۔

اور دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی نوجوان ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھالیتا ہے اور کوئی جماعتی عہدہ قبول کر لیتا ہے تو وہ ایک حصار میں آجاتا ہے اور ہر لحاظ سے اپنی اصلاح کر لیتا ہے کیونکہ اول تو اسے مثال پیش کرنا مقصود ہوتا ہے، دوسرے خدا تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے وہ اپنے لاپرواہی کے اوقات کو مصروف اوقات میں تبدیل کر لیتا ہے اور اس طرح وہ ایک دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔جہاں حقوق العباد کی ادائیگی بھی اس کا جزو ایمان بن جاتی ہے۔

چنانچہ حفیظ بٹ شہید بھی چھوٹی سی عمر کے باوجود ایک مثالی نیک بخت طالب علم تھا جو ابھی میٹرک میں ہی زیر تعلیم تھا۔لوگوں کے دکھوں کو بانٹتا تھا اور

اکثر ان کے چھوٹے چھوٹے مسائل حل کرتا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضلوں سے اسے چُن لیا اور اپنے فضلوں سے نواز لیا۔ اور جب خدا تعالیٰ ہی کسی کو نواز لے تو بندہ اس کی گود میں آجاتا ہے۔ سو حفیظ بٹ خدا تعالیٰ کی گود میں آگئے اور پھر خدا تعالیٰ کی نظر ہر وقت ان پر ہوتی ہے اس لئے ان کے اچھے اعمال کا بدلہ خدا تعالیٰ انہیں بڑھ چڑھ کر دیتا اور کوتاہیوں، لغزشوں اور کمزوریوں کو ڈھانپتا چلا جاتا ہے کیونکہ وہ اس کا ہوتا ہے۔ اور پھر ایک دن اگست ۱۹۹۴ء کو خدا تعالیٰ نے انہیں انعام یافتہ گروہ میں شامل کر کے دائمی حیات عطا کر دی۔ الحمد للہ علی ذالک

ایسے خدام کے لئے ہی تو حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے ایک وسیع تر اعلان کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ ”پس میں جماعت کے نوجوانوں کو آج توجہ دلاتا ہوں کہ وہ اپنے آپ کو اسماعیلی رنگ میں رنگین کر لیں، ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار رہیں، خواہ وہ اخلاقی ہو یا جسمانی یا مالی۔ یاد رکھو اسلام کا درخت قربانی کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا۔ اگر تمہاری خواہش ہے کہ اسلام ترقی کرے تو اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کرو۔۔۔ پس یہ مت سمجھو کہ تمہاری قربانیاں کون دیکھے گا، تمہاری قربانیوں کو دیکھنے والا آسمان پر خدا موجود ہے اور وہ انہیں دنیا سے مٹنے نہیں دے گا۔ تم اسماعیلی نمونہ دکھاؤ، تب تم دیکھو گے کہ زمین تمہارے لئے بدل جائے گی اور آسمان تمہارے لئے بدل جائے گا۔“ [1] بیشک حضور خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی بات سو فیصد روشن ہو کر سامنے آئی ہے کہ ”زمین تمہارے لئے بدل جائے گی۔“

سو قارئین! ہم نے دیکھا کہ حفیظ احمد بٹ کو کوئی نہیں جانتا تھا کہ کون ہے اور کہاں ہے، مگر جب ایک نوجوان ۱۸ سالہ خادمِ احمدیت اپنے محبوب امامِ

---

[1] خطبات محمود، حصہ دوئم، صفحہ ۱۹۴

وقت کی صداقت پر اپنے لہو سے مہر ثبت کر دیتا ہے تو وہ ہماری قوم کا ایسا خادم ہے جو اسماعیلی رنگ میں رنگین ہے اور ہر گھر میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ ہر ماں اس کے لئے دعا گو ہے۔ اور آج تو اس کے پیارے خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ تعالیٰ نے بھی عرب وعجم تک اعلانِ عام کر دیا ہے کہ حفیظ احمد بٹ نے اپنی جان راہِ حق میں قربان کی ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ:

''حفیظ بٹ ایک ہمدرد، ملنسار اور مخلص احمدی تھے۔ اور دعوت الی اللہ کا بہت شوق رکھتے تھے۔ نماز باجماعت کے علاوہ تہجد بھی ادا کیا کرتے تھے اور چندہ دینے میں بہت باقاعدہ تھے۔ بوقت قربانی عمر اٹھارہ سال تھی اور غیر شادی شدہ تھے۔ پسماندگان میں آپ کے والدین، چھ بھائی اور چار بہنیں ہیں۔ چار بھائیوں اور تین بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں اور دو بھائی ابھی تک غیر شادی شدہ ہیں۔''

یہ تھی گواہی امامِ وقت کی جو آج اس جوان کے لئے نہایت دردمند، دکھ بھرے غمگین لہجے میں جماعت کے لئے ایک اعلانِ عام تھا۔ کہ اے احمدی نوجوانو، نمونہ تمہارے سامنے ہے۔ وقت کی پکار سنو اور اس مضبوط تناور درخت فنا فی اللہ کی شاخیں بن جاؤ جو کبھی شہزادہ لطیف نے لگایا تھا۔ اس قربانی والے درخت کو قربانی ہی زندہ رکھے گی۔

تہجد شعار: قارئین کرام! تہجد میں جاگنے والا حفیظ خدا سے رات کی تنہائی میں خدا تعالیٰ کی قربت پا گیا کیونکہ تہجد ایک ایسا نسخہ ہے کہ خدا کی ملاقات کا آزمودہ اور مستند نسخہ مانا جاتا ہے اور یہی وہ نسخہ تھا جو حفیظ احمد شہید نے ہر چند آزمایا۔ وہ چھوٹی سی عمر میں راتوں کو جب بسترِ آرام چھوڑنا نہایت مشکل امر ہے، اکثر و بیشتر رات کی تاریکی میں نور کی تلاش کرتا تھا۔ سو اس نے وہ نور پا لیا جو کئی لوگ جنگوں میں دشمنوں کی صفوں کو چیر کر ڈھونڈتے ہیں اور کئی لوگ محبت و وفا سے پا لیتے

ہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کی ذرہ نوازی ہے مگر تقویٰ شرط ہے، محبتِ الٰہی شرط ہے اور اتباعِ رسول شرط ہے۔

مگر حیف ان لوگوں پر ہے جو یہ تک نہیں جانتے کہ جس قوم کو وہ للکار رہے ہیں، اس کا بچہ بچہ خدا کی راہ میں قربان ہونے کے لئے سر ہتھیلی پر لئے پھرتا ہے۔ اے نونہالانِ جماعت، زندہ باد! تم بڑھے چلو کیونکہ یہی مومن کی شان ہے کہ وہ ایمان کی روشنی سے راستے منور کرتا چلا جائے اور ''یہی وہ معیار ہے جس پر ہمیں اللہ تعالیٰ لانا چاہتا ہے، پیشتر اس کے کہ ہم جنت کے امیدوار ہوں۔ یہ راہ تنگ ہے، یعنی اگر کسی کو دائمی آرام اور راحت کی اور اللہ تعالیٰ کے نیچے آ جانے کی ضرورت کا احساس ہے تو اسے اس راہ سے گزرنے کے بغیر چارہ نہیں۔''

یہ راہ تنگ ہے، پر یہی ایک راہ ہے
دلبر کی مرنے والوں پر ہر دم نگاہ ہے

پس یہی وہ معیار ہے جس کا فرمان بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ حضرت مہدی علیہ السلام نے جماعت کے سامنے واضح لفظوں میں رکھ دیا اور راہ کی دشواریاں بھی بیان فرما دی ہیں

مگر

جس قوم کے مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے راہِ مولیٰ میں قربان ہونے میں راہِ نجات خیال کرتے ہوں، اور اس ابدی زندگی میں ہی احیاء دین کی نوید پاتے ہوں، وہ قوم یقیناً قابلِ صد ستائش ہے اور ضرور بضرور وہ دنیا کے کناروں تک پھیل کر ثابت کر دے گی کہ خدا اور اس کے محبوب رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے والے آسمان کے ستاروں کی طرح بڑھتے ہیں اور روشن ہوتے ہیں اور روشن کرتے ہیں۔ الحمد للہ۔

محبتِ الٰہی اور عشقِ رسول: محبت کے اظہار کے کئی نمونے ہوتے ہیں۔ کبھی

کبھی اپنے محبوب سے اظہارِ محبت سیدھا ہی کر لیتے ہیں اور کبھی کبھی اس کے پیاروں سے پیار کر کے اظہارِ محبت کا ثبوت دیتے ہیں۔ ایسے ہی خدا تعالیٰ کی محبت ہے کہ ہم اس کی عبادت کرتے ہیں، اطاعت کرتے ہیں اور اس کے لئے قربانی کرتے ہیں، یہ سب کچھ ہمیں اس مبارک وجود کی بدولت ہاتھ آتا ہے جس کا قصیدہ فرشتوں نے بھی گایا ہے اور جس پر درود و سلام خدا تعالیٰ نے خود پیش کیا ہے اور وہ ذاتِ گرامی سرورِ کائنات محمد مصطفےٰ ﷺ کی مبارک ہستی ہے لہٰذا جہاں ہمارے پیار کا اظہار عشقِ رسولؐ سے ظاہر ہوگا وہاں یہ بھی ایک محبت کے اظہار کا نمونہ ہے کہ انسان اپنے رسولؐ فخرِ کائنات سیدِ وُلد آدم کے ارشادات سے محبت کرے، آپؐ کی اطاعت و اتباع میں اپنی نجات تلاش کرے اور آپؐ کے نقشِ قدم پر چلے۔ دوسرے لفظوں میں ہم محبتِ الٰہی اور عشقِ رسول ﷺ کا اظہار اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب قرآن مجید سے محبت کر کے بھی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ جہاں تک حفیظ احمد بٹ کی محبت کا تعلق ہے، تو آپ ہمیشہ قرآن مجید سے پیار کرتے تھے، اسے ترجمہ سے پڑھتے اور اکثر خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔ قرآن مجید پڑھانے کی سعادت آپ کی بزرگ ہمسائی محترمہ صفیہ بی بی کو حاصل ہے۔ الحمدللہ کی حفیظ احمد شہید نے قرآن و حدیث سے سچی محبت کر کے خدا تعالیٰ کی نظر میں ایک مقام بنا لیا جو برکتوں کا متحمل ہوا۔

جہاں تک روزہ کا تعلق ہے تو شہید کا روزہ بھی ایک مبارک عمل تھا کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ قرآن شریف روزہ دار کے لئے اللہ تعالیٰ سے سفارش کرے گا تو اس سے بڑھ کر کیا سعادت ہو سکتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور انور ﷺ نے فرمایا۔ ''روزہ اور قرآن دونوں بندے کی سفارش کریں گے''۔ یعنی اے میرے خدا میں نے اس بندے کو کھانے پینے سے دن کے وقت روکے رکھا، لہٰذا اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما، اور

قرآن کہے گا، اے خدا، میں نے اسے رات کے وقت سونے سے روکے رکھا، اس لئے اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ چنانچہ یہ سفارشیں قبول ہوں گی۔ انشاء اللہ اور یہ تمام خواہشیں خدا نے ان کی جھولی میں ڈال دیں۔ الحمدللہ.

شہید حفیظ احمد بٹ کی یہ زبردست خواہش تھی کہ وہ فوج میں بھرتی ہوکر ملک وقوم کی خدمت کریں۔ یہ جذبہ بھی ایک اعلیٰ درجے کا ہوتا ہے مگر شہید نہیں جانتے تھے کہ خدا تعالیٰ نے آپ کو خدا تعالیٰ کی راہ میں قربانی پیش کرنے لئے منتخب کیا ہے اگرچہ جہاد جو ملک وملت کے لئے کیا جاتا ہے، عظیم جانثاری کا نمونہ پیش کرتا ہے

تاہم، یہ بھی یادرہے کہ توحید پر جان نچھاور کرنا اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت پر مہر لگانا ایک ایسا غیر فانی عمل ہے جو پختہ ایمان کی بدولت ہی رونما ہوتا ہے۔

پختہ ایمان: خدا تعالیٰ نے اپنے فضلوں سے اس نوجوان کو ایسا بے مثل پختہ ایمان عطا کیا تھا کہ حفیظ شہید نے ملک وقوم کی خدمت کے موقع کی تمنا کی تھی مگر اس کے خدا نے اسے فنافی اللہ فنافی الرسولؐ ہونے کا موقع عطا کردیا یعنی وہ ایک صلہ مانگتا تھا، خدا نے اسے دس گنا اجر عطا کیا اور ہمیش کی زندگی اسے عطا کردی۔

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ”ایمان مثل ایک انجن کے ہے جب ایمان ہوتا ہے تو سب حقوق خود بخود نظر آجاتے ہیں اور بڑے بڑے اعمال اور ہمدردی خود ہی انسان کرنے لگتا ہے لیکن یہ ہر ایک کے نصیب میں نہیں۔“

مومن کی شان: آیئے! مومن کی شان سمجھنے کے لئے جانی قربانی جو خوشی وغم کا ایک جامع نام ہے، جان لیں۔ قارئین! اگر یہاں حزن اور خوف کی تشریح و

تفصیل ہی سمجھ لیں تو بہت سہولت ہوگی۔ حضور خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خطبہ جمعہ ۱۲ مئی ۱۹۸۶ء میں بہت واضح روشنی ڈالی ہے۔ آیت کریمہ ہے کہ:

"وَلاَ خوف علیھم ولا ھم یحزنون"

جس کے متعلق حضور نے فرمایا: لاَ خوف علیھم ، کی تو پوری کی پوری کھلی کھلی سمجھ ایک مومن کو آجاتی ہے۔ آج سارے پاکستان میں احمدی بلا امتیاز خوف سے بالکل عاری ہیں اور جن پر ابتلاء کا یہ دور گزر رہا ہے، ان کی طرف سے بار بار بڑی شدت کے ساتھ اور اصرار کے ساتھ یہ اطلاعیں پہنچتی ہیں کہ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ہمارے دل پر کیا گزر رہی ہوگی تو بالکل ہرگز کسی قسم کا غم نہ کریں۔۔۔۔۔ جو کچھ بھی اس راہ میں گزرے گی، ہم اس کو اپنے سر پر لیں گے اور ہرگز پیچھے نہیں رہیں گے۔ ہم۔۔۔۔ اس عہد میں یک جان اور یک قالب ہو چکے ہوں تو ان کو موت یا کوئی خوف کیسے ڈرا سکتے ہیں؟؟

اور

جہاں تک حُزن کا تعلق ہے، فرمایا، شہید ہونے والے بھائیوں کے لئے کوئی غم نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شہادت کی جو معرفت رکھنے والی قومیں ہیں، وہ اس غم کو دل کو لگا کر نہیں بیٹھ جایا کرتیں۔۔۔۔ دل کا نرم ہونا اور آنسو کا بہنا اپنے پیاروں کے لئے یہ وہ حُزن نہیں جس کی نفی یہاں فرمائی گئی ہے۔ وہ حُزن ہوتا ہے جو جان لیوا ثابت ہوتا ہے یا دل کے ساتھ لگ کر بیٹھ جاتا ہے۔ ہمیشہ کے لئے ان کے ساتھ مایوسیاں چمٹ جاتی ہیں، حسرتیں ان کے وجود کا حصہ بن جاتی ہیں، مگر شہادت پانے والوں کے لئے اس قسم کا غم نہ کوئی مومن محسوس کر سکتا ہے نہ مومن کی شان ہے کہ ایسے غم میں مبتلا ہو، بہت بڑا انعام ہے، بہت ہی بڑا مرتبہ ہے جو شہادت پانے والوں کو نصیب ہوتا ہے۔[1]

---

[1] خطبہ جمعہ، مئی ۱۹۸۶ء

تو یہ ہے مومن کی شان کہ وہ ان غموں کو خوشیوں میں تبدیل کر دے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے در و دیوار پر نازل ہو جاتی ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"جو لوگ خداہ کی راہ میں شہید ہوتے ہیں، انہیں مردہ نہ خیال کرو بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے خدا کے پاس خوشی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

پس شہید حفیظ احمد بٹ شجاع تھا، حلیم طبع تھا، غریبوں کا دوست تھا، حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی روحانی اولاد تھا جو خدا تعالیٰ کی راہ میں فنا ہو کر صداقتِ مسیح موعود کا زندہ ثبوت بن گیا۔ اب کوئی غم بھی اس کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتا اور چھوٹا ہو کر نظر آنے لگ جاتا ہے۔

اے شہیدِ وفا! آپ کو مبارک ہو کہ آپ کا خون سرزمینِ فیصل آباد پر یہ گواہی پیش کرتا چلا گیا کہ

"جو مر گئے انہیں کے نصیبوں میں ہے حیات
اس راہ میں زندگی نہیں ملتی بجز ممات
جو خاک میں ملے اسے ملتا ہے آشنا
اے آزمانے والے یہ نسخہ بھی آزما"

اور اے زمینِ فیصل آباد، تیرا بھی عجیب مقدر ہے کہ اہل فیصل آباد نے دو بھائیوں کو ایک ہی وقت میں راہِ مولیٰ میں شہید کر کے ان کے خون سے تجھے رنگین کر دیا۔ وہ کلمہ توحید کو بلند کرنے والے تھے اور تجھے توحید کی برکات سے روشنی دینے والے تھے۔ اب خدا تعالیٰ انہیں بلند کرے گا اور حقیقی سلامتی عطا کرے گا جو ہمیشہ ہمیشہ کی سلامتی ہوگی، انشاء اللہ۔ پس اے محترم حفیظ بٹ اور محترم وسیم بٹ، آپ کی شہادت نے ثابت کر دیا کہ:

"اسلام کی رگوں میں اب بھی خون چل رہا ہے۔

اب بھی رسول کریم ﷺ سے عشق رکھنے والے کلمۂ توحید پر جانیں قربان کر رہے ہیں۔''

عشقِ کلام الٰہی: قارئین کرام! جیسے کہ میں نے ابھی ذکر کیا تھا کہ محبتِ الٰہی اور عشقِ رسول ﷺ کا اظہار اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب قرآن مجید سے محبت کر کے بھی کر سکتے ہیں کیونکہ یہ وہ نور ہے کہ جس کے آگے کوئی ظلمت ٹھہر نہیں سکتی۔ اور میں نے یہ بات تمام شہداء کے حالاتِ زندگی میں نوٹ کی ہے کہ تقریباً تمام شہداء کو قرآن پاک سے عشق کی حد تک محبت تھی۔ حقیقت میں دیکھا جائے تو قرآن پاک سے محبت کرتے ہی مطاہر لوگ ہیں اور ان کی یہ محبت ان کو عشق کی عمیق وادی میں لے جاتی ہے جہاں ان کو وصلِ خدا نصیب ہو جاتا ہے اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق ہر شخص اپنا دامن بھر لیتا ہے۔

شہید حفیظ احمد بٹ کے عشقِ قرآن کے متعلق بھی یہی دیکھا گیا ہے کہ وہ نماز باجماعت اور تہجد کے علاوہ قرآن پاک کی تلاوت بھی بہت باقاعدگی سے کرتے تھے۔ وہ خوش الحانی سے تلاوت کر کے بہت خوش ہوتے تھے۔ وہ دعوت الی اللہ کے لئے سرگرم رکن کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ اور اطفال الاحمدیہ میں یہ جذبہ پیدا کرنے کی سعی کرتے تھے۔ پس جب جذبہ سچا ہو تو خدا تعالیٰ کی نصرت آتی ہے اور ضرور آتی ہے چنانچہ ایک دن ایسا آ گیا کہ خدا تعالیٰ نے بٹ فیملی کی ایمانی قوت کو مضبوط تر کر کے دکھا دیا۔ ۱۹۳۳ء سے مخالفت وعداوت کی آندھی بالآخر حفیظ احمد کی شہادت پر جا ختم ہوئی اور شہید حفیظ کے لئے جنت کی راہیں ہموار کر گئی جب کہ دشمنِ دین کے لئے دوزخ کا دروازہ کھول گئیں۔ بیشک شہادت ایک انعام ہے جو ۱۹۹۴ء کو حفیظ احمد بٹ ابن اللہ رکھا کو شہداء کے زمرے میں شامل کر گیا۔

واقعۂ شہادت: وقوعہ کے روز حفیظ شہید کے بھائی اور کزن جو سمن آباد میں

ہی رہتے تھے، فیکٹری سے کھانا کھانے کے لئے دو پہر کو گھر آئے۔ حسبِ عادت دو پہر کا کھانا کھانے کے بعد جب واپس جانے لگے تو چھ لوگ جو مفسد طبیعت کے مالک تھے اور ہمیشہ تاک میں رہتے تھے، حملہ آور ہوئے۔ وسیم احمد پر فائرنگ کھول دی مگر وسیم احمد بچ کر گھر گئے اور جا کر پسٹل نکال لائے اور گولی چلادی۔ مگر گولی نہ چل سکی کہ اتنے میں دشمن کی گولی ان کی ٹانگ پر لگی مگر یہ بہادر تھے، حواس باختہ نہیں ہوئے بلکہ لپک کر کسی حملہ آور سے بندوق چھین لی اور چلادی جس کی زد میں آکر ایک حملہ آور مر گیا مگر دوسرے ہی لمحے حفیظ احمد کو بھی فائرنگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آمنے سامنے کے مقابلہ سے وسیم احمد کو دوسری گولی دل پر لگی اور حفیظ احمد کے باقی بھائی اور کزن بھی زخمی ہوئے۔ سب کو ہسپتال پہنچا دیا گیا جہاں حفیظ احمد تو خدا تعالیٰ کو پیارے ہو گئے اور دوسرے امین بٹ صاحب اور اختر کریم بٹ صاحب کئی دن خطرناک صورت میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے لیکن خدا تعالیٰ نے شہادت حفیظ احمد اور وسیم احمد کے مقدر میں لکھی تھی۔ سو خدا نے باقی بٹ فیملی کو اپنی حفظ و اماں میں رکھا تا کہ داعی الی اللہ بن کر دنیا میں تبلیغ کے میدان میں آگے بڑھیں اور اپنے بھائی حفیظ احمد کی قربانی کو زندہ رکھیں۔

زندگی کی خواہش میں ہم نے مر کے دیکھا ہے
لوگ جو سمجھتے ہیں ہم نے کر کے دیکھا ہے

تم دیکھو گے کہ انہی میں سے قطرات محبت ٹپکیں گے
بادل آفات و مصائب کے چھاتے ہیں اگر تو چھانے دو

اک نظر میں

نام	حفیظ احمد بٹ
والد صاحب کا نام	محترم اللہ رکھا صاحب بٹ
جائے پیدائش	فیصل آباد، سمن آباد
عمر	۱۹۷۶ء
شغل	پاور لومز میں کام کرتے تھے
تعلیم	میٹرک
لباس	خوش لباس
تاریخ شہادت	۳۰ اگست ۱۹۹۴ء
آلۂ شہادت	پستول
نماز جنازہ	مکرم محمد اشرف ممتاز، مربیٔ سلسلہ
تدفین	ربوہ
شمائل	تہجد گزار تھے، ہمدرد اور ملنسار تھے، تبلیغ کے لئے جذبہ رکھتے تھے۔

اک نگاہِ مہر

قدموں میں اپنے آپ کو مولیٰ کے ڈال تُو
خوف و ہراس غیر کا دل سے نکال تُو
سایہ ہے تیرے سر پر خدائے جلیل کا
دشمن کے جور و ظلم سے ہے کیوں نڈھال تُو
اے میرے مہربان خدا! اک نگاہِ مہر
کانٹا جو میرے دل میں چُبھا ہے نکال تُو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہٗ ونصلی علی رسول کریم

ھوالناصر، خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

محترم میاں محمدؐ صادق شہید

قرآن خدا نما ہے خدا کا کلام ہے
بے اس کی معرفت کا چمن ناتمام ہے

خدا تعالیٰ سے پیار کرنے کے بھی بہت سے راستے ہیں۔ ہر وہ شخص جو محبت الہیٰ کی بھیک مانگتا ہے، وہ اپنی طبیعت و مزاج کے مطابق راستہ تلاش کر لیتا ہے۔ مثلاً کچھ لوگ خدا سے محبت کے اظہار میں خدا کے محبوب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں مبتلا ہو جاتے ہیں یعنی خدا کا پیار حاصل کرنے کے لئے اس کے پیارے سے پیار کرتے ہیں۔ اور کچھ لوگ خدا کے کلام میں خدا کا چہرہ تلاش کرتے ہیں۔ اور اس مبارک کلام میں انہیں وصلِ الٰہی حاصل ہو ہی جاتا ہے۔ الغرض منزلِ عشق ایک ہی ہوتی ہے لیکن عشاق راستے جدا جدا اختیار کر کے کامیاب ہو ہی جایا کرتے ہیں۔ ہاں، شرط تلاشِ یار ہے۔ میاں محمدؐ صادق بھی ایک ایسے ہی دیوانے تھے جو خدتعالیٰ کی تلاش میں سرگرداں تھے اور اس کے وصل کو قرآن مجید کی ہر بات میں ڈھونڈا کرتے تھے۔ وہ قرآن مجید کے سچے عاشق تھے اور قرآن پاک ہی ان کا واحد سہارا تھا۔ اسی سہارے کے طفیل بالآخر ایک دن وہ خدا کا قرب حاصل کر لیتے ہیں۔ آیئے آج اس نشست میں دیکھتے ہیں کہ

میاں محمدؐ صادق کون تھے اور کہاں کے رہنے والے تھے، ان کے شب و روز خداتعالیٰ کی تلاش میں کیسے گزرتے تھے؟

میاں محمدؐ صادق صاحب کے والد محترم کا نام علم دین تھا۔ میاں علم دین صاحب ٹھٹھہ راجیاں جہلن ضلع گوجرانوالہ میں رہائش پذیر تھے۔ ان کا چھوٹا سا گاؤں ایک چھوٹی سی مسجد پر مشتمل تھا جہاں کے امام محترم میاں علم دین صاحب خود تھے۔ اور احمدیت کے بے حد مخالف بھی تھے۔ میاں علم دین صاحب کا خاندان آٹھ دس افراد پر مشتمل تھا۔ یہ کنبہ میاں عنایت اللہ صاحب، میاں ہدایت اللہ صاحب، میاں محمدؐ صادق صاحب اور میاں محمدؐ خاں صاحب، سردار بی بی، فاطمہ بی بی اور رحمت بی بی، تمام گھرانہ مذہبی لحاظ سے بہت بیدار تھا مگر محترم علم دین صاحب کی مخالفتِ مہدی نے انہیں زیادہ ہی سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ ہمیشہ پڑتال کرتے رہتے تھے جس کے نتیجے میں خدا تعالیٰ نے ان کے خاندان میں سے میاں محمد ہدایت اللہ صاحب کو ہدایت عطا کر دی اور انہوں نے بیعت کر کے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی جماعت میں شمولیت اختیار کر لی۔ بعد میں خدا تعالیٰ نے علم دین صاحب کے دوسرے بیٹے محمد صادق صاحب کو بھی اپنے فضلوں سے روشنی عطا کی اور انہوں نے ۱۹۷۱ میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور اللہ تعالیٰ کے ہدایت یافتہ لوگوں میں شامل ہو گئے۔

گویا میاں محمد صادق صاحب نے اپنی آبائی مخالفت کے باوجود ۱۹۷۱ء میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو شناخت کر کے حقیقی اسلام میں شمولیت کر لی اور یوں اپنی زندگی کلیۃً بدل ڈالی۔ اور مخالفتِ مہدی کو اتنا پیچھے چھوڑ دیا کہ سابقون کی فہرست میں جا شامل ہوئے۔ الحمد للہ

تھوڑی دیر کے لئے اگر ہم مخالفت کی کڑیاں ملا کر دیکھیں تو ہمیں ایمان کی تازگی نصیب ہو گی یہ کہ بیشک آخرین منھم ایک زندہ حقیقت اور سچائی

ہے۔ قارئین! آپ کو یاد ہو گا کہ ابوجہل نے حضرت رسول خدا ﷺ کی مخالفت میں زمین و آسمان ایک کر دیا تھا لیکن پھر اسی مخالفت کے بادلوں سے بارش اور بارانِ رحمت برسی تو حضرت عکرمہؓ کا وجود سامنے آیا اور یہ وہی خوش نصیب شخص تھا جس کو محمد مصطفےٰ ﷺ دنیا میں سب سے زیادہ محبوب تھے۔ اور اسی طرح حضرت خالد بن ولیدؓ ہمارے لئے ایک واضح نقش چھوڑ گئے ہیں جو یہی بتا رہا ہے کہ کبھی کبھی آندھی مخالفت کا طوفان رحمت کے بازو پھیلا دیا کرتا ہے۔ یہ وہی عظیم سپوتِ اسلام تھا جو سیف اللہ کے طور پر ایسے ابھرا کہ ہر جنگ میں دشمن کو شکست فاش دی اور اسلام کا سورج فتح و شادمانی سے ایسا چمکا کہ دشمن شرمندہ تعبیر ہوا۔ ہاں، اگرچہ خالد بن ولیدؓ سینکڑوں ابتلاؤں سے گزرے مگر خدا تعالیٰ نے اپنے وعدہ کے مطابق حضرت خالد بن ولیدؓ کو ثمرِ الثمرات بنا دیا۔ الحمد للہ.

بالکل اسی طرح مولوی علم دین صاحب جو ہمیشہ مخالفت اور دشمنی میں پیش پیش ہوا کرتے تھے، ان کی اسی مخالفت کے شجر سے ایسا میٹھا پھل ہوا کہ جو میاں صادق کی شکل میں ایک دن جام شہادت پی کر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت کا علمبردار بن گیا۔ الحمد للہ.

محمد صادق صاحب کا گزر اوقات محنت مزدوری تھا۔ وہ کبھی لوہار کا کام کرتے، کبھی لکڑی فروخت کرتے اور کبھی مکان تعمیر کرتے۔ بہر حال وہ اپنے کنبہ کا روزگار ہنر مندی سے پیدا کرتے مگر ہر کام کے ساتھ ایک لگن ان کے دل میں جاگزیں تھی کہ **دعوت الی اللہ** ہی برکت کا موجب ہے۔ یہی میرے ہر کام میں زندگی کی روح ڈال سکتی ہے لہٰذا وہ اپنے اوقات کو ایسے ترتیب دیتے کہ زیادہ حصہ تبلیغ میں صرف کرتے تھے۔

جماعتی کاموں میں وابستگی: میاں محمد صادق ہمیشہ اپنے کاموں کو اس طرح ترتیب دیتے تھے کہ جماعتی مصروفیت ہمیشہ اولین مقام پا جاتی تھی۔ اجتماعی جلسہ

اجلاس میں شمولیت ضروری قرار دیتے اور یہی کوشش ہوتی کہ صفِ اول میں جگہ حاصل کرلوں۔ اور اس کے لئے ہمیشہ وقت کی پابندی ضروری ہوا کرتی ہے۔ صادق شہید ایک محنتی مزدور شخص تھے۔ وہ اکثر وقت سے پہلے ہی جلسوں میں پہنچ کر پوری توجہ سے ساری کاروائی میں حصہ لیتے تھے۔ چندوں کے لحاظ سے نہ صرف وہ اپنا چندہ ادا کر دیتے بلکہ گھر کے افراد کو تاکید بھی کرتے کہ اپنا اپنا چندہ ضرور ادا کرو اور وہ کئی بار سب بہن بھائیوں کا چندہ ادا کر دیتے تھے۔ خدا تعالیٰ نے آپ کو تین بیٹے اور ایک بیٹی عطا کی ہے۔ یہ مختصر سا خاندان دینی لحاظ سے اپنے ابا جان کے نمونہ کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیشہ ایک امتیازی مقام پر قائم رہا ہے۔ ان کی والدہ محترمہ آمنہ بی بی صاحبہ نے عام تعلیم تو حاصل نہیں کی ہوئی تھی مگر قرآن مجید بخوبی پڑھاتی ہیں اور تقریباً گاؤں کے لوگوں کو وہ ہمیشہ تعلیم قرآن سے فیض یاب کرتی ہیں۔

محترم میاں عصمت اللہ صاحب، محترم میاں نعمت اللہ صاحب اور عزیزم میاں رضوان احمد صاحب اور ایک بیٹی نصرت شہزادی صاحبہ ہیں، جنہوں نے تعلیم کے میدان میں کوئی نہ کوئی شناخت و شناسائی ضرور حاصل کی ہے اور یہ بڑی خوشکن بات ہے کہ جن بچوں کا باپ پیٹ پالنے کے لئے صبح و شام محنت و مزدوری کرتا ہے مگر بچوں کو اسکول کی زندگی ضرور مہیا کرتا ہے۔

عصمت اللہ صاحب نے انڈر میٹرک ہی کیا ہے اور آرمی میں ملازم ہیں جب کہ دوسرا بیٹا نعمت اللہ صاحب مڈل تک ہی تعلیم حاصل کر سکے اور صابن والی فیکٹری میں کام کر رہے ہیں۔ اگرچہ فیکٹری والوں نے بوجہ احمدی کاریگری پرابلم ڈال رکھی ہیں۔ تیسرا بیٹا رضوان احمد انڈر میٹرک ہے اور نصرت شہزادی صاحبہ ابھی تک زیر تعلیم ہیں اور اپنے والد صاحب کے شوق کے مطابق مزید تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ المختصر میاں صادق صاحب شہید کا خاندان گو تعلیم یافتہ زیادہ نہیں ہے مگر

حروف شناس ضرور ہے اور تعلیم قرآن کے زیور سے محلے بلکہ گاؤں والوں کو بھی مزین کرتا ہے۔اوراس سے بڑی خوش قسمتی کیا ہوگی کہ تعلیم وتعلم کے میدان میں ان کا موضوع صرف اور صرف قرآن پاک ہی ہو۔

عشق قرآں، وسیلۂ قرب: قرب کا وسیلہ ڈھونڈنے کے لئے تلاوت قرآن مجید پر وہ بہت زیادہ زور دیتے تھے۔گویا نماز، روزہ اور تلاوتِ کلام مجید محمد صادق شہید کی زندگی کا ایک لازمی جزو تھا اور زیادہ حصہ رات کا جائے نماز پر ہی دیکھے جاتے تھے۔وہ ساری حیاتی تہجد ادا کرتے رہے۔صلوٰاۃ تسبیح بھی ان کا معمول تھا جو بہت شوق سے وہ ادا کیا کرتے تھے۔نماز باجماعت پڑھنا بچپن سے ہی والدین نے عادت ڈال دی تھی۔نماز اس طرح پڑھتے تھے کہ آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے تھے۔نماز میں آنسو بہانا تو انہوں نے فرض بنالیا ہوتا تھا اور کہتے تھے۔بیٹا عصمت اللہ! جس نماز میں خدا تعالیٰ نظر نہ آئے، اس نماز کا کیا فائدہ۔۔نماز اس طرح پڑھا کرو کہ خدا تمہیں ہر طرف دیکھائی دے اور پھر رحمتیں نازل ہوتے بھی معلوم ہوں۔اس طرح خدا کے ہوجاؤ کہ خدا تعالیٰ خود پوچھے کہ میرے بندے!! کیا تکلیف ہے، تو کیوں آنسو بہا رہا ہے؟ چنانچہ وسیلۂ قرب کی تلاش میں رہنے والے صادق شہید ساری رات تلاوت کرتے اور لفظی ترجمہ پر غور کرتے رہتے تھے۔یاد رہے کہ تلاوت قرآن اور قرآن پاک سے محبت کرتے ہی مطاہر لوگ ہیں اور یہ محبت انہیں عمیق عشق کی وادی میں لے جاتی ہے جہاں بالآخر انہیں قرب خدا اور وصلِ حبیب حاصل ہو ہی جاتا ہے۔اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق ہر شخص اپنا اپنا کوزہ علم وعرفان کے نور سے بھر لیتا ہے۔اور یہ جواہرات ہی ایسے ہیں کہ نہ زر سے ملتے ہیں نہ زمین سے بلکہ نصیب سے ملتے ہیں اور محمد صادق شہید اپنے نصیب کے ساتھ ہی اپنی ہمت کے مطابق ڈھونڈتے رہے اور بالآخر خدا تعالیٰ نے انہیں قبول فرمالیا اور اپنی محبت عطا کر دی اور ''جب

اللہ کسی سے محبت کرتا ہے تو اسے دنیا سے ایسے بچاتا ہے جیسے بیمار کو پانی سے بچایا جاتا ہے۔"[1]

عشقِ قرآن: حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں کہ "**قرآن کا حربہ ہاتھ میں لو تو تمہاری فتح ہے۔اس نور کے آگے کوئی ظلمت ٹھہر نہ سکے گی۔**"[2]

چنانچہ اس حربہ کو میاں صادق صاحب نے اپنے ہاتھ میں ایسے لیا کہ ہر کامرانی کو اس چشمہ سے ہی تلاش کرنا شروع کر دیا اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ وہ قرآن مجید کے سچے عاشق تھے اور یہی ان کا واحد سہارا تھا۔ ان کی محبت قرآن پاک سے اس حد تک تھی کہ گھر میں وہ تمام افرادِ خاندان کو قرآن پاک کی برکات حاصل کرنے کے لئے تاکید کرتے۔ اور اپنی بیوی کو بھی اس بات پر آمادہ کرتے کہ وہ محلے کی بچیوں کو بیش از بیش قرآن مجید پڑھائیں چنانچہ وہ اپنے گاؤں راجباں جہلن میں تمام بچوں کو قرآن مجید بہت اچھی طرح پڑھاتی تھیں۔ اس طرح خدا کے فضل سے قرآن پاک کی تلاوت اس گھر کی چار دیواری کی گونج تھی جو صبح و شام گاؤں کو کلام اللہ سے فیض یاب کرتی تھی۔

حقوق العباد: محترم شہید نے اپنی محبت کے پھیلاؤ کو وسعت دیتے ہوئے انسانوں کی خدمت میں ہمہ تن توجہ دی اور کچھ حصہ وقت کا اپنی کاروباری زندگی سے نکال کر تبلیغ میں صرف کیا اور ہر شعبہ زندگی میں تبلیغ کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کسی نہ کسی شخص کو زیرِ تبلیغ ضرور رکھتے تھے اور کئی لوگوں نے ان کی دعوت کی وجہ سے احمدیت میں شمولیت کی سعادت حاصل کر لی۔ وہ بڑے فاتحانہ انداز میں اظہار کیا کرتے تھے کہ میرے شاگرد بھی قرآن و حدیث میں مہارت

---

[1] خطبہ جمعہ، ۱۲ نومبر ۱۹۹۹ء

[2] الحکم، جلد ۴، ۱ اکتوبر ۱۹۰۰ء

حاصل کر چکے ہیں۔

بیشک وہ داعی الی اللہ کے عظیم سپوت تھے۔ان کی زندگی کا نصب العین صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل کرنا تھا۔وہ ہمیشہ ایسا کام کرتے تھے جو خدا تعالیٰ کی رحمت کو جذب کرنے کو موجب ہو اور انسانوں کی مدد کرنا انسانوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا،ان کا اپنی ہمت کے مطابق حدیث سنا کر بات سمجھانا اور اپنے بچوں کو خصوصاً نیکی کی طرف رغبت دلانا،سب سے بڑی عبادت ہے جس کی توفیق خدا تعالیٰ نے ایک غریب، نادار اور مصروف ترین مزدور کو عطا کی ہوئی تھی ۔خود محنت کرتے تھے اور انسانوں کو سہولت اور آسانی مہیا کر کے ان کی خدمت میں خوشی محسوس کرتے تھے۔

درود شریف: حضرت رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ وہ شخص قیامت کے دن میرے قریب تر ہوگا جو مجھ پر بہت زیادہ درود بھیجتا ہوگا۔" [1]

شہید محمد صادق وہ خوش نصیب شخص تھے کہ جن کی زندگی کا معمول ہی درود شریف کی برکات میں پوشیدہ تھا۔وہ ہر وقت نبی پاک محمد مصطفیٰ ﷺ پر درود وسلام بھیجتے رہتے تھے اور وہ اسی عملِ محبت میں اپنے محبوب محمد رسول پاک ﷺ کو تلاش کرتے رہتے تھے۔ان کے بیٹے عصمت اللہ لکھتے ہیں کہ "میرے ابا جان کی زندگی کا واحد مقصد اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ پیار تھا۔یہی ان کی دولت تھی۔وہ دنیا کی کسی چیز سے اتنا پیار نہیں کرتے تھے جتنا خدا تعالیٰ سے پیار کرتے تھے اور پھر خدا تعالیٰ بھی ان کی ہر بات سنتا تھا اور پیار کرتا تھا۔میں نے بہت دفعہ دیکھا کہ ہم جو بھی کام کرتے،ان کی غیر موجودگی میں کر لیتے تھے تو عموماً ہمیں وہ صبح تک بتا دیتے تھے کہ بیٹا! یہ کام غلط ہے،آپ ایسا نہ کیا کرو ورنہ برباد ہو جاؤ گے۔یعنی ہر وقت خدا تعالیٰ کی کرامات ان کے ساتھ تھیں۔"

---

[1] خطبہ جمعہ، فرمودہ ۱۲ نومبر ۱۹۹۹ء

قبولیت دعا بھی ایک کرامت ہے جس کے متعلق بانی سلسلہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا:

غیر ممکن کو یہ ممکن میں بدل دیتی ہے
اے میرے فلسفیو، زورِ دعا دیکھو تو

ہوا یہ کیسے؟ دعا پر اگر زور دیا جائے تو قارئین کرام! آپ کو حیرت ہوگی کہ میاں صادق نے چونکہ ساری توجہ تبلیغ پر مرکوز کر دی ہوئی تھی، اس لئے ان کی سعی سے کئی لوگ احمدیت میں شامل ہوئے۔ ان نئے بیعت کرنے والوں میں ایک میاں اشرف صاحب بھی تھے جو میاں صادق کے مدلل مذاکرات اور دعوتِ تبلیغ سے احمدیت میں شامل ہوئے تھے۔ وہ پہلے میاں صادق صاحب سے قرآن مجید باترجمہ پڑھا کرتے تھے، بعد میں احمدیت یعنی حقیقی اسلام کو شناخت کر کے دائرہ احمدیت میں داخل ہو گئے تھے۔ گویا ان کے خاص شاگرد تھے۔ قدرت خدا ایک وقت ایسا آیا کہ وہ راہِ خدا میں فنا ہو گئے اور صداقتِ احمدیت کے لئے قربانی پیش کر دی اور اس طرح وہ خدا کے شہید بندوں میں شمار ہو گئے۔

اور جب اس انعامِ الٰہی کی خبر محترم میاں صادق صاحب کو ملی تو وہ حیرت اور رشک کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کر بے ساختہ کہنے لگے۔ ''میرا شاگرد ہو کر میرے سے زیادہ مقام حاصل کر گیا۔'' یہ کیسے؟ یہ کیسے؟ یہ کیسے ہوا؟

رشتۂ محبتِ الٰہی: قارئین! یہ آہ ایک دعا بن گئی اور اس دن سے محمد صادق نے اپنی زندگی کا مدعا یہی قرار دیا کہ خدایا، مجھے شہادت عطا کر، خدایا میں پیچھے رہ گیا۔ یہ ایک التجا تھی جو صادق شہید کا نصب العین بن گئی اور یاد رہے کہ اصل میں حق الیقین کا ارفع مقام یہی ہے جو خدا تعالیٰ اپنے پیار کرنے والوں کو عطا کر دیتا ہے۔ بیشک محبت الٰہی یہی تو ہے کہ وہ جنبش نہ کھانے والے ایسے میدانِ عمل وسیع تر

کر جاتے ہیں اور ایسے نقوش چھوڑ جاتے ہیں کہ ان کو ذبح ہوتے دیکھنے والی نگاہ بھی میدانِ عمل میں اتر آتی ہے اور کسی شہید کے نقشِ پا خالی نہیں رہنے دیتی بلکہ دوسرے دفعتاً اس پر اپنے پاؤں رکھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نہ صرف کھڑے ہو جاتے ہیں بلکہ اس پر استقامت سے قائم رہتے ہیں اور یہ سب کچھ کیا ہے، یہ تمام محبت الٰہی کا نشہ ہے وگرنہ صرف سوئی چبھنے سے ہی انسان دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ مگر داعی الی اللہ ایک ایسا ایمان لے کر قدم جماتا ہے کہ کروڑ اموات کے سامنے استقلال کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ اور وہ حق الیقین رکھتا ہے کہ کوئی موت اس پر وارد نہیں ہوگی، وہ زندہ رہے گا اور تا قیامت زندہ رہے گا۔ اور پھر جیسے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ" تیرے تھوڑے کو قبول کیا جائے گا، تیری اخلاص کی وجہ سے تیری اس کوشش کے نتیجہ میں کہ تو خدا تعالیٰ کی محبت میں فانی ہونا چاہتا ہے اور تو اپنا سب کچھ اس کے حضور پیش کرنا چاہتا ہے۔ تجھے ایک ایسا موتی مل جائے گا جو **انمول** ہے، دنیا میں اس کی کوئی قیمت نہیں۔"[1] اس انمول موتی کی تلاش میں میاں محمد صادق صاحب نکل کھڑے ہوئے اور قرآن مجید کے موتیوں سے جھولی بھرنی شروع کر دی۔ وہ صبح وشام قرآن مجید کی تلاوت محبت بھری دردناک آواز میں کرتے اور ساری ساری رات قرآن مجید پڑھتے تھے۔ اور آنسو بہانا آپ کا مشغلہ تھا۔ دل لگی تھی تو صرف نمازِ تہجد میں تھی۔ ہم نے اکثر دیکھا کہ جائے نماز پر سوئے ہوئے ملتے تھے یعنی رات کا زیادہ حصہ آپ نماز پڑھتے تھے اور رات کی تنہائی میں اپنے خدا سے ملاقاتیں کرتے تھے۔ بالآخر ایک دن قرآن پاک کی محبت نے وہ انمول موتی میاں صادق صاحب کو ۸ نومبر ۱۹۹۶ء کو عطا کر ہی دیا۔ اور اس طرح وہ انعاماتِ ربانی کے تمام مدارج طے کرتے ہوئے نبوت کے قدموں میں جا گزیں ہو گئے اور یہی تو تمام عبادات اور ریاضیات کا ماحصل ہوا

[1] خطبہ جمعہ، فرمودہ، ۲۳ دسمبر ۱۹۷۷ء

کرتا ہے کہ انسان قربِ محمد ﷺ حاصل کرلے۔

بیشک اسلام کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے وصال کے لئے کسی لمبے چوڑے مجاہدے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر کسی شخص کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جائے اور وہ ہمہ تن التجا بن کر دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے قرب سے نوازے اور اس کے لئے اپنی برکتوں کے دروازے کھول دے، تو اللہ تعالیٰ اسے اپنا قرب عطا کردیتا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے: اُجِیبُ دَعوۃَ الدّاعِ اِذَ دَعَانِ (سورہ بقرہ آیت ۲۳) کہ "جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارے تو میں اس کی دعا ضرور قبول کرتا ہوں۔" قبولیت دعا کا وعدہ فرما کر اللہ تعالیٰ نے وصال الٰہی کا راستہ ایسا آسان کردیا کہ اگر مومن کے دل میں ذرا بھی محبت ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کو پا سکتا ہے۔

اور

عبادت کی اصل غرض یہی ہے کہ بندہ کو خدا کے قریب کردے۔ چنانچہ محمد صادق شہید نے عبادات میں قرآن مجید اور درود شریف کو اپنی جان کا حصہ بنا لیا۔ اور ایک ایسی لو لگائی کہ بخشش کے سب راستے قرآن پاک کے مبارک لفظوں میں ڈھونڈھ نکالے۔ وہ خود قرآن مجید سوچ و بچار سے پڑھتے، لوگوں کو پڑھاتے اور تدبر کرنے کے لئے نصیحت کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کتاب اللہ میں سے ایک حرف پڑھنا ایک نیکی ہے اور ہر نیکی کا بدلہ خدا تعالیٰ دس گنا دیا کرتا ہے۔

لھٰذا

"قیامت کے دن قرآن بطور شفیع ہوگا": یہی ان کا نصب العین تھا اور یہی ان کی زندگی کا نچوڑ تھا۔ سو خدا تعالیٰ نے اپنے کلام کے عاشق کو چن لیا او رشہداء کی فہرست میں ایک مثالی مقام عطا کردیا۔ الحمد للہ علی ذالک۔

بحیثیت داعی الی اللہ: داعی کے لفظی معنی ہیں پکارنے والا، دعوت دینے والا اور داعی الی اللہ سے یہی مراد ہے کہ خدا کی طرف دعوت دینے والا۔ یعنی خدا

تعالیٰ کی قربت اور وصال کے لئے کسی کو مدعو کرنا اور اس کے لئے راستے ہموار کرنا ایک بہت بڑا کٹھن مرحلہ ہے۔ مگر خدا تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے مومن خود نکھرتا ہے، پھر بندہ ہمت کر سکتا ہے کہ دوسرے کو نمونہ پیش کرے اور دلائل کی روشنی میں راستے ہموار کرے۔ یعنی جب تک وہ خود خدا کو نہ پا لے گا، وہ کسی دوسرے کو کیسے راستہ دکھائے گا۔ پس ''آؤ ایک نور کا تمہیں پتہ دوں'' کا نعرہ وہی شخص لے کر نکلتا ہے جو حلیم الطبع، ہمدرد، عالم اور نبض شناس ہوتا ہے، اور پیش ہے آج

امامِ وقت کی گواہی: میاں محمد صادق کا حلم، نورِ علم، نبض شناسی اور شوقِ دعوت کا یہ عالم ہے کہ امامِ وقت حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے شہید صادق صاحب کی دعوت الی اللہ کی خدمت کی گواہی دیتے ہوئے فرمایا ''**احمدیت کا پیغام پھیلانے میں ننگی تلوار تھے۔ ان کی دعوت الی اللہ سے کٹر اہلحدیث احمدی ہوئے، ۸ نومبر ۱۹۹۶ء کو قربان ہوئے۔**'' [1]

اے خاندان میاں محمد صادق!! آپ کو مبارک ہو کہ آپ کے والدِ محترم کی قربانی آپ کو ایک امتیازی مقام عطا کر گئی، خود تو وہ جان جانِ آفریں کو پیش کر کے ہمیش کے لئے زندہ ہو گئے مگر آپ کو بھی ایک دائمی روحانی زندگی عطا کر گئے۔ خدا کرے کہ میاں محمد صادق کی گواہی جو اس کے پیارے امام نے دی ہے، اس کی نسلوں میں بھی اپنا رنگ چڑھائے۔ ان کے بیٹے بھی احمدیت یعنی حقیقی اسلام کے لئے ننگی تلوار ثابت ہوں اور دلائل قاطعہ سے غیر از جماعت لوگوں کو ہدایت کا موجب ہوں۔ آمین۔

میاں عصمت اللہ صاحب، میاں نعمت اللہ صاحب اور میاں رضوان احمد صاحب اور نصرت شہزادی صاحبہ، آپ کے والد صاحب شہیدِ محترم نے اپنی

---

[1] الفضل، جولائی ۱۹۹۹ء

دعا و پکار کے نتیجے میں خدا سے مانگ مانگ کر شہادت پالی اور انعام اربعہ میں صالحیت سے بلند مقام جا حاصل کیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ وہ کہتے تھے کہ ''خدایا مجھے شہادت عطا کر، خدایا میں پیچھے رہ گیا۔'' مگر یاد رہے کہ یہ نعمت انہیں خدا تعالیٰ نے محبتِ الٰہی، عشقِ رسول ﷺ اور قرآن مجید کے صدقے عطا کی ہے۔ آپ بھی خداوند عالم پیارے اور آقا محمد مصطفی ﷺ اور قرآن پاک کی برکات حاصل کرنے کے لئے وقف زندگیاں کریں تا کہ وہ عظیم درخت جو آپ کے صحنِ گلشن میں میاں صادق شہید لگا گئے ہیں، ثمر آور ہو اور خشک نہ ہونے پائے۔ آمین۔

آپ کے لئے خلیفۂ وقت کی آواز آپ کے در و دیوار پر گونج رہی ہے۔ ''خوب یاد رکھو کہ یہ راستہ خوف و ہراس اور نقصان و ضیاع کا راستہ ہرگز نہیں بلکہ لامتناہی انعام پانے کا سلسلہ ہائے کوہ ہے جس کے انعام کی ہر منزل پہلی منزل سے بلند تر ہے۔ پس خوشی اور عزم و یقین کے ساتھ آگے بڑھو اور آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ تبلیغِ اسلام کی جو لو میرے دل میں جگائی ہے اور آج ہزاروں احمدی سینوں میں جل رہی ہے، اس کو بجھنے نہیں دینا، اس کو بجھنے نہیں دینا، تمہیں خدائے بالا و برتر کی قسم اسے بجھنے نہیں دینا۔'' [1]

ہمارے چہروں کی مسکراہٹ نہ چھن سکی نہ چھن سکے گی
کہ ہم ہیں نور محفلوں میں وفا کی شمعیں جلانے والے

واقعہ شہادت: چونکہ میاں محمد صادق شہید ٹھٹھہ راجباں کے رہنے والے تھے۔ مگر نماز جمعہ عموماً بلکہ ہمیشہ ہی ساتھ کے ایک گاؤں چک چٹھہ ضلع حافظ آباد میں جا کر ادا کیا کرتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ اپنے گاؤں میں تمام نمازیں ادا کرتے مگر چونکہ چک چٹھہ میں بڑی جماعت تھی۔ اس لئے گھر سے وضو کر کے ساڑھے گیارہ بجے صبح بروز جمعہ چل پڑتے تھے۔ سارا راستہ درود شریف پڑھتے

---

[1] خطبہ جمعہ، فرمودہ اپریل ۱۹۸۳ء

جاتے اور وہاں سے نماز ادا کر کے دوستوں سے مل کر ایمان افروز باتیں سن کر بہت خوش ہوتے تھے۔ یکم نومبر ۱۹۹۶ء کو آپ نے پروگرام بنایا کہ اپنے بیٹے عصمت اللہ کی شادی وغیرہ کی تاریخ مقرر کی جاوے چنانچہ شادی کے معاملے میں وہ ساتھ والے گاؤں مانگٹ اونچا ضلع حافظ آباد میں پیدل پہنچے۔ مانگٹ اونچا جاتے ہوئے کچھ طبیعت خراب ہوگئی تھی۔

چنانچہ ۱۵ نومبر ۱۹۹۶ء شادی کی تاریخ مقرر ہوئی۔ چنانچہ ۸ نومبر ۱۹۹۶ء کو حسب عادت ساتھ کے گاؤں چٹھہ حافظ آباد میں نماز جمعہ ادا کرنے کے لئے پیدل روانہ ہوگئے۔ پیدل چلنا ان کی عادت تھی اور چٹھہ ضلع حافظ آباد ان کے گاؤں سے زیادہ فاصلہ پر نہیں تھا۔ قادر آباد فیڈر کا ایک حصہ اس گاؤں کے ساتھ سے گزرتا ہے جس کے ایک کلومیٹر فاصلہ پر گوجرانوالہ روڈ ہے۔ اس گاؤں کے ساتھ ساتھ ایک نہر بھی بہتی ہے یعنی گاؤں شمال کی طرف ہے اور گوجرانوالہ روڈ جنوب کی طرف ہے۔ ایک کلومیٹر جانے کے بعد پکی سڑک آجاتی ہے اور اس کے مشرق کی طرف تین کلومیٹر کے فاصلہ پر چک چٹھہ ہے، اسی طرح محمد صادق صاحب جب گوجرانوالہ روڈ سے ۲۰۔۲۵ گز کے فاصلے پر پہنچے تو دشمن گھات میں بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ اپنی ۳۸ بور پستول سے فائر کر دیا اور اس طرح ایک خداشناس عاشقِ رسول کریم ﷺ کو ساڑھے بارہ بجے بروز جمعۃ المبارک ہمیش کی زندگی دے گیا۔ پس آج باوضو نماز ادا کرنے والے میاں صادق شہید جو اپنے گھر سے پیدل دوسرے گاؤں میں جا کر نماز پڑھتے تھے، نماز سے پہلے ہی اپنی منزل پر جا پہنچے اور شہید محترم محمد اشرف صاحب (جو ان کے شاگرد خاص) تھے، کے نقش پا کو خالی نہیں رہنے دیا بلکہ فوراً اور دفعتاً اس پر اپنے پاؤں رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کے تھوڑے کو قبول فرما کر ان کے اخلاص کی وجہ سے انہیں وہ انمول موتی عطا کر دیا جس کی دنیا میں کوئی قیمت نہیں ہوتی۔

مبارک ہو آپ کو اے شہیدِ محترم کہ آپ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی برکت سے دعا کی کرامات دکھائی جو بیشک ایک امتی نبی کی جماعت کو خصوصی طور پر حاصل ہونی چاہیئے۔ خدا تعالیٰ ہماری یہ کرامات دعا جاری وساری رکھے اور ہم اپنے پیارے مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت کا بیّن ثبوت بن کر سامنے آئیں۔ آمین۔

قارئین کرام! یاد رہے کہ میاں محمد صادق شہید کو جب یہ خبر ملی تھی کہ ان کا شاگرد خاص محمد اشرف شہید ہو گیا ہے تو وہ بے تاب ہو گئے تھے اور بہت روئے تھے اور یہ دعا اس دن سے جاری کر دی تھی کہ اے خدا، مجھے پیچھے نہ چھوڑنا، میرا شاگرد ہو کر محمد اشرف بڑھ گیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ''کیا یہ گولی میری قسمت میں نہیں تھی، میرا حق میرے شاگرد کو کیسے مل گیا؟ کیا میں اس قابل نہیں ہوں، مولیٰ کیا میرے نصیب میں یہ مقام نہیں ہے؟

اکثر یہ سوال اپنے مولیٰ کے سامنے دہرایا کرتے تھے اور صبح وشام قرآن مجید کی برکات میں اپنی متاع وخواہشات کو ڈھونڈا کرتے تھے۔ وہ سجدہ میں روتے اور دعا کرتے کہ خدایا، مجھے تیری جنات میں شہادت کی تمنا ہے، مجھے قبول فرما، مجھے اپنی راہ میں قربان ہونے کا موقع عطا فرما۔''

سو خدا تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور اپنے فضلوں سے نوازتے ہوئے شہادت عطا کر دی۔ دراصل یہ انعام بھی آخرت پر کامل یقین رکھنے والوں کا مقدر ہوا کرتا ہے اور انہیں ہی نصیب ہوتا ہے۔ اور آخرت پر یقین قربانیوں کی جرأت پیدا کر دیتا ہے۔

''مومنوں کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وبالآخرة هم يوقنون، یعنی وہ آخرت پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ یعنی وہ قربانیاں کرتے ہیں اور کرتے ہی چلے جاتے ہیں اور اس امر کی کوئی پرواہ نہیں کرتے کہ ان قربانیوں کا پھل انہیں زندگی

میں بھی ملتا ہے یا نہیں ملتا۔ کیونکہ وہ آنے والی زندگی پر یقین رکھتے ہیں اور یہ یقین ان کے اندر اتنی جرأت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ قربانیوں کی آگ میں اپنے آپ کو بلا دریغ جھونک دیتے ہیں۔" [1]

مجھ کو دے اک فوق عادت اے خدا جوش و تپش
جس سے ہو جاؤں میں غم میں دین کے اک دیوانہ وار
وہ لگا دے آگ میرے دل میں ملت کے لئے
شعلے پہنچیں جس کے آسمان تک بے شمار

---

[1] تفسیر کبیر، جلد ہفتم، صفحہ ۳۳۷

اک نظر میں

نام	:	محترم محمد صادق صاحب
والد محترم کا نام	:	محترم علم دین صاحب
جائے پیدائش	:	ٹھٹھہ راجباں جہلن، گوجرانوالہ
بیعت	:	۱۹۷۱ء، بیعت، خلیفۃ الثالثؒ
عمر، قد و قامت	:	----
لباس	:	شلوار قمیض
پیشہ	:	محنت مزدوری
تاریخ شہادت	:	۸ نومبر ۱۹۹۶ء
آلۂ شہادت	:	پستول
جائے شہادت	:	چک چٹھہ، ضلع گوجرانوالہ
عہدہ بروقت شہادت	:	----
نماز جنازہ	:	----
آخری آرام گاہ	:	----
لواحقین	:	تین بیٹے اور ایک بیٹی اور بیوہ
شمائل	:	نبض شناس، ہمدرد، محنتی، داعی الی اللہ، قرآن پاک کا عاشق، صلوٰۃ تسبیح اور تہجد میں برکات میں متلاشی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہٗ و نصلی علی رسول کریم

هوالناصر، خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

محترم ملک اعجاز احمد شہید

اے محبت عجب آثار نمایاں کر دی
زخم و مرہم برہ یار تو یکساں کردی

محترم ملک عنایت اللہ صاحب کو خدا تعالیٰ نے تین بیٹے ملک مظفر احمد صاحب، ملک ریاض احمد صاحب اور ملک اعجاز احمد صاحب اور دو بیٹیاں عطا کیں جن کے نام ممتاز بیگم اور رشیدہ بیگم تھا۔ ملک عنایت اللہ صاحب کی بیگم کا نام جمیلہ بیگم تھا جو کہ ایک مخلص صحابی محترم شیخ خدا بخش صاحب کی بیٹی تھیں۔ محترمہ جمیلہ بیگم صاحبہ چونکہ ایک صحابی کی اولاد تھیں، اس لئے بہت مخلص اور دیندار ساتھی تھیں۔ یہ خاندان ڈھونیکی تحصیل وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ میں رہائش پذیر تھا اور خدا کے فضل سے میاں بیوی اپنے بچوں کی تمام نگہداشت اور تربیت اسلامی رنگ میں کرتے تھے۔ خصوصاً والدہ محترمہ جمیلہ صاحبہ اعلیٰ اقدار سے پروان چڑھانے کی خواہش مند تھیں۔ اور بفضل خدا انہیں خدا تعالیٰ نے توفیق بھی عطا کی۔ علم کی دلدادہ تھیں اور ان کی بہت کوشش تھی کہ تمام بچوں کو تعلیم و تعلم کے میدان میں شناسائی حاصل ہو جاوے مگر چونکہ یہ تمام بزرگ کئی پشتوں سے تاجر ہی چلے آئے تھے۔ اس لئے اعلیٰ تعلیم کی بجائے اپنے کاروبار کی گہرائیوں میں مہارت حاصل

کرنے میں کوشاں رہتے۔ان کا خاندانی کاروبار سیمنٹ اور ہارڈ ویئر کا کام تھا۔وہ مشہور ڈیلرز تھے اور دیانتداری کی وجہ سے وزیرآباد کے مشہور تاجر تھے۔سب ان کی نیک نامی اور دیانت داری کی تعریف کرتے تھے چنانچہ ملک عنایت اللہ صاحب کا سب سے چھوٹا بیٹا ملک اعجاز احمد بچپن سے ہی بہت ہونہار اور ذہین بیٹا تھا۔خاص طور پر انہیں اپنی ماں سے بہت پیار تھا اور ماں جو ہمیشہ یہ خواہش رکھتی ہے کہ اس کا ہر بچہ بڑھ چڑھ کر ترقی کرے اور ایک اعلیٰ مقام بنا لے۔مگر خدا تعالیٰ کے ارادے اور منشاءِ الٰہی کو کون جان سکتا ہے، خدا نے اپنے ارادے سے ایک شخص کو قربانی کے لئے چُن لیا اور اس کے اعمال دن بدن نکھرتے گئے

پس

ماں جس کے پاؤں تلے جنت ہے، وہ خود جنت میں اس وقت جائے گی جب وہ یہ شرط پوری کرے کہ اس نے بچوں کی صحیح اور اعلیٰ تربیت کی۔یعنی گویا جنت میں جانے کے لئے ماں کو یہ شرط پوری کرنی پڑے گی کہ اپنے بچوں کو دینی اقدار کے لحاظ سے تعلیم و تربیت کے لحاظ سے اور اخلاقی اطوار کے لحاظ سے ایک مثالی مقام پر لا کھڑا کرے۔سو ملک اعجاز شہید کی والدہ محترمہ بھی ایک مثالی ماں ہیں جنہوں نے رسول کریم ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کو تمام پہلوؤں سے اپنے بچے میں سمونے کی حتیٰ المقدور کوشش کی، سرورِ کائنات فخرِ دو عالم محمد مصطفی ﷺ کے نمونے کی پیروی کرنے پر آمادہ کیا اور احادیث کی روشنی میں انہیں راہنمائی دیتی رہیں۔سو بفضلِ خدا وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئیں۔تو وہ ماں جس کا بچہ شہید ہوا، تمام عورتوں کے لئے ایک فخر کا مقام ہے اور وہ گود جس میں بچے نے پرورش پائی، ہمیشہ منور رہے گی کیونکہ ایسی گود اور گھر نے اس ہیرے کو تراشا ہے جو آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے روشنی کا مینار ہوگا۔انشاء اللہ.

آیئے! آج ملک اعجاز احمد شہید سے ملتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ۳۰ نومبر ۱۹۹۸ء تک انہوں نے اپنے شب و روز کیسے گزارے؟ کون جانتا تھا کہ ڈھونیکی تحصیل وزیر آباد میں پیدا ہونے والا ایک بچہ جو ملک عنایت اللہ صاحب اور محترمہ جمیلہ بیگم صاحبہ کا سب سے چھوٹا بیٹا اور آخری اولاد ہے اپنے خاندان میں، اول نمبر پر مقام بنا لے گا۔ ایک ایسا مبارک دن آئے گا کہ وہ آخری بیٹا راہِ حق میں قربانی پیش کر کے تمام خاندان کو بلند کر جائے گا اور انہیں ایک امتیازی نشان دے جائے گا۔ بیشک یہ وہی برکات و ثمرات ہیں جن کا وعدہ بانیٔ سلسلہ احمدیہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی جماعت سے فرمایا تھا۔ ''یہ مت خیال کرو کہ خدا تمہیں ضائع کرے گا، تم خدا کے ہاتھ کا ایک بیج ہو، جو زمین میں بویا گیا۔ خدا فرماتا ہے کہ یہ بیج بڑھے گا، اور پھولے گا اور ہر ایک طرف سے اس کی شاخیں نکلیں گی، اور ایک بڑا درخت ہو جائے گا۔ پس مبارک وہ جو خدا کی بات پر ایمان رکھے اور درمیان میں آنے والے ابتلاؤں سے نہ ڈرے۔''[1]

مثال کے طور پر خدا کی بات پر ایمان رکھنے والے مبارک وجود کا ذکر حضرت بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ ان لفظوں میں کرتے ہیں۔ **''وہ ہر ایک امر میں میری اس طرح پیروی کرتا ہے جیسے نبض کی حرکت تنفس کی پیروی کرتی ہے۔''**

''یہ ثمر احمدیت وہ مبارک وجود ہے کہ جسے خدا تعالیٰ نے اعلیٰ درجہ کا صدیق بنایا اور نور اس کے پاس نازل ہوتے ہیں۔''

یہ مبارک وجود حضرت خلیفۃ المسیح الاول کا ہے جنہوں نے خدا کی بات پر ایمان رکھ کر خلافت کی برکات حاصل کیں۔ پس اسی طرح جنہوں نے بھی خدا کی بات پر ایمان رکھ کر شہادت کی برکات حاصل کیں، خدا تعالیٰ کا نور ان کے

---

[1] رسالہ الوصیت، صفحہ ۱۴

لئے نازل ہوگا اور یہی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی برکات ہیں جو کبھی اعجاز احمد کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں اور ڈاکٹر عقیل بن عبدالقادر اور کبھی صاحبزادہ غلام قادر احمد کی شکل میں۔

علم دوستی: اگرچہ ابتدائی تعلیم اعجاز احمد صاحب نے ہمیشہ امتیازی پوزیشن سے حاصل کی اور گورنمنٹ پبلک اسکول میں فرسٹ آتے رہے اور چونکہ ان کی والدہ صاحبہ کو علم سے بہت عشق تھا، اس لئے وہ ہمیشہ اپنے بیٹے کو تعلیم کی طرف رغبت دلاتی رہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میٹرک تک بہت اعلیٰ نمبروں پر کامیابی حاصل کرتے رہے۔ پھر ڈگری کالج میں داخلہ لے کر دیا اور فیصل آباد میں ڈگری کالج سے انٹر تک تعلیم مکمل کی کیونکہ یہ والدہ صاحبہ کا آبائی وطن تھا جہاں انہیں کالج وغیرہ کی سہولتیں میسر آئیں، اس لئے اپنے بیٹے کو تعلیم کی تکمیل کے لئے بھیج دیا اور پھر بالکل اسی طرح اعجاز صاحب کو خدا نے جب ایک بیٹی سے نوازا تو انہوں نے وہ جذبۂ آگہی و علم و عرفان اپنی بیٹی صبا کے لئے اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ ڈھونیکی میں کوئی معیاری اسکول نہیں تھا اس لئے بلاتردّد اسے گجرات انگلش میڈیم اسکول میں داخل کروا دیا اور پہلے ویگن کا انتظام تھا۔ پھر ویگن والے نے چھوڑ دیا تو خود روز لے کر جاتے اور واپس لے کر آتے تھے۔ تقریباً ۹۔۱۰ میل کا سفر تھا جو وزیرآباد سے گجرات تک ہر روز کرتے تھے۔ پھر گھر آ کر اس کی پڑھائی میں بھی مدد دیتے تھے۔ محترمہ طاہرہ اعجاز صاحبہ لکھتی ہیں کہ اعجاز صاحب نے اپنی بیٹی صبا کی تعلیمی امداد اس حد تک کی کہ اسکول کے بعد گجرات کے کالج میں داخلہ لے دیا اور ہمیشہ اپنے کاروبار سے زیادہ اس کے اسکول و کالج کے اوقات کا دھیان رکھا۔ صبا کہتی ہیں کہ میرے ساتھ محبت کا یہ انداز تھا کہ جب سے میں اسکول داخل ہوئی، مجھے F.Sc تک کسی کے ساتھ آنے جانے نہیں دیا۔ بلکہ خود اسکول و کالج کے دروازہ پر لینا اور چھوڑنا ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ جب لاہور کسی کام سے جاتے

تو میرے کالج کے ٹائم پر پہنچ جاتے اور میں انتظار میں رہتی۔

چنانچہ جہاں تک علم سے محبت و دوستی کا تعلق ہے، اعجاز شہید محترم نے طبقہ نسواں کو علم کے زیور سے مزّین کیا اور حضرت رسول کریم ﷺ کی حدیث مبارکہ پر عمل کرتے ہوئے اپنے گاؤں اور شہر سے باہر بھیج کر حصولِ علم میں صبا اعجاز کی مددِ کی۔ اگرچہ وہ اپنے باپ دادا کے کام میں بھی اسی انہماک سے مشغول تھے پھر بھی صبا کو انگلش اور میتھس انہوں نے خود پڑھایا کیونکہ دونوں مضامین میں وہ بہت ماہر تھے بلکہ محلّہ کے بچے اور غیر از جماعت لوگ بھی یہ مضامین ان سے پڑھنے کے لئے آتے تھے۔

<u>خُلق ملنساری:</u> خُلقِ ملنساری بھی شہید اعجاز احمد کا ایک منفرد خُلق تھا۔ وہ ہمیشہ دوسرے سے اس طرح ملتے جیسے مدتوں سے اس کے جاننے والے ہیں بلکہ احسان کا کوئی رشتہ دونوں میں یکساں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ تمام اہل محلّہ اور بازار کے کاروباری لوگ دل و جان سے عزت کرتے تھے اور حُسنِ سلوک کے گرویدہ تھے۔

محترم تنویر ملک جو کہ آپ کے بڑے بھائی کا بیٹا تھا، آپ کا پیارا دوست تھا۔ دونوں میں دوستی کا ایسا رنگ تھا کہ رشک آتا تھا۔ بیشک ملنساری بھی ایک نمایاں خُلق ہے جو اعجاز ملک صاحب کا امتیاز تھا اور اسی خُلق کی بناء پر تمام عزیز و اقارب اور غیر از جماعت لوگوں سے ان کا حلقہ میل ملاقات بہت وسیع تھا۔

قارئین! یہاں ایک فطری سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر اعجاز احمد صاحب کا حلقۂ احباب غیر از جماعت لوگوں اور ہمسایوں میں بہت وسیع تھا تو پھر آخر کس انہونی طاقت نے آپ کو قربان کیا اور دن دھاڑے آپ کی زندگی چھین لی جو کئی دکھی لوگوں کے کام آتی تھی؟ تو واضح ہو کہ اس کا مفصل اور ٹھوس جواب تو بہت طوالت کا موجب ہوگا، مختصراً عرض ہے کہ ہر فرعون اپنے وقت میں اپنے خود ساختہ

اصول اور من گھڑت عقائد کو اپنی فرعونی طاقت سے بروئے کار لانے کا عادی رہا ہے۔ سو آج بھی علماءِ سوٗ جب ظاہر ہوئے تو انہوں نے اسلام کا ہی ٹھیکہ لے لیا۔ اور من گھڑت عقائد وضع کرائے۔ حالانکہ وہ اسلام کی ABC سے بھی واقف نہیں ہیں۔ وہ یہ تک نہیں جانتے کہ رسول کریم محمد مصطفےٰ ﷺ کا لایا ہوا دین قرآن مجید کا نچوڑ ہے۔ یعنی ہر نکتہ مذہب، ہر مسئلہ اسلام اور اصول وفلسفہ ٔ اسلام قرآن پاک میں قطعی طور پر بیان ہے اور یہی یکتا واحد، پہلا اور آخری راہنما ہے۔ احادیثِ نبوی ؐ کا نمبر اس کے بعد ہے اور سنت و اجماع دین کو سمجھے کے لئے آخری نمبر پر ہیں۔

لیکن

مولانا مودودی صاحب جیسے عالم ومفکر جب کلمہ گو کو مرتد قرار دے کر قتل مرتد کا فلسفہ بیان کرتے ہیں تو وہ قرآن مجید کو بالائے طاق رکھ کر صرف حدیث پر تکیہ کر لیتے ہیں اور حدِیث کو بھی توڑ مروڑ کر پیش کر دیتے ہیں۔ اور یہی آج کے فرعون کا مشغلہ وکرتب ہے جسے وہ سنہری لفظوں میں **خدمت اسلام** کہتا ہے۔ کسی کی گردن زنی کرنا آج کے عالم کی خدمتِ اسلام ہے۔ حالانکہ **لاَ اکراہ فاالدین** ہمارے فطری مذہب کا بنیادی نکتہ ہے اور قرآن مجید میں خاص طور پر وضاحت سے فرمان خداوندی میسر ہے کہ ”جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کو اختیار کرنا چاہئے (تو وہ یاد رکھے) کہ وہ اس سے ہر گز قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت میں وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا اور جو لوگ اسلام لانے کے بعد منکر ہو گئے ہوں۔۔۔ان کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب ہی کی لعنت ہو۔ وہ اس میں رہیں گے، نہ تو ان پر عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ انہیں ڈھیل دی جائے گی سوائے ان لوگوں کے جو اس کے بعد توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں۔ اور اللہ یقیناً بہت سننے والا اور بار بار رحم کرنے

والا ہے۔ جو لوگ ایمان لانے کے بعد منکر ہو گئے ہوں اور کُفر ہی کی حالت میں مر گئے ہوں، ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا بھی، جسے وہ فدیہ کے طور پر پیش کرے، ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ ان لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا"۔ (سورۃ آل عمران، آیات ۸۶ تا ۹۲)۔

ان آیات کریمہ کے ترجمہ سے یہ امر ظاہر و باہر ہے کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان کو اس کے ارتداد کی بناء پر کوئی سزا نہیں دے سکتا۔ "وہ اس میں رہتے چلے جائیں گے" کے الفاظ سے واضح طور پر اگلے جہان کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی یہ کہ اسلام سے ارتداد اختیار کرنے والوں کو اگلے جہان میں سزا ملے گی نہ کہ اس جہان میں۔ خیالی گھوڑے دوڑا کر کتنا ہی کھینچ تان سے کام لیا جائے تو کوئی سمجھدار انسان مرتد پر اللہ کی لعنت کے ذکر سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتا کہ اُسے اس امر کی اجازت مل گئی ہے کہ جو بھی اُس کی نگاہ میں مرتد ہو، اُسے قتل کر دے۔۔۔۔ بلکہ قرآن مجید میں تو ایسے مرتدوں کے لئے توبہ واستغفار اور اس کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے معافی کے امکان کا ذکر کیا ہے۔ یعنی اگر ایسے مرتد توبہ کر کے پھر اسلام قبول کر لیں تو خدا تعالیٰ انہیں معاف کر دے گا۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ کوئی مرتد جسے سزا کے طور پر قتل کر دیا گیا ہو، اسی دنیا میں توبہ کر کے تلافیٔ مافات کس طرح کر سکتا ہے؟ ظاہر ہے جسے قتل کر دیا گیا ہو، اس کے لئے تو یہ ممکن ہی نہیں رہتا کہ وہ توبہ واستغفار کے ذریعہ تلافی کر سکے۔ تلافی کے امکان کا ذکر صاف بتلا رہا ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے ہی نہیں۔ [1]

مگر

آج کے شعلہ بیان، شوریدۂ سر ملّاؤں نے خشک فتویٰ پر اکتفاء کیا اور مسجدوں،

---

[1] مذہب کے نام پر خون۔ صفحہ ۳۰۰ تا ۳۰۱

منبروں پر اعلامِ عام کر دیا کہ مرتد کی سزا قتل ہے اور احمدی مرتد ہے جس کے نتیجہ میں کئی بار خون کی ہولی کھیلی جاتی رہی مثلاً ۱۹۵۳ء میں، ۱۹۷۴ء میں اور تا وقت تحریر یہ زہر لوگوں کی رگوں میں اتارا جا رہا ہے کہ احمدی مرتد ہے۔۔۔

قتل کر ڈالو انہیں یہ مرتد و دجال ہیں
ہے دل آزاری میں مضمر شانِ ناموسِ رسولؐ
گھر جلا ڈالو تم ان کے مال لوٹ لو
اس طرح ہو جاؤ تم قربانِ ناموسِ رسولؐ
ایک میرزائی کو مارو، سات حج کا ہے ثواب
حضرت مُلّا کا ہے اعلان ناموس رسولؐ [1]

پس یہ جنون لے کر ہر نادان شخص آگے بڑھنے کے لئے بے تاب رہتا ہے اور یہی سبب ہے کہ ملک اعجاز جیسے خلیق، ملنسار اور خلقِ خدا کے غمگسار کو ظلم کی برچھی سے آزما کر ظلم کی حد کر دی۔ پس ظالم نے بہت ظلم کیا اور ظلم پر آخری مُہر لگا کر ملک اعجاز احمد شہید کو رتبۂ شہادت سے فیضیاب کر دیا۔ پھر ایک دن یکم دسمبر ۱۹۹۸ء کو محترم ملک مظفر احمد صاحب، محترم ریاض احمد صاحب، محترمہ ممتاز بیگم صاحبہ اور محترمہ رشیدہ بیگم صاحبہ کا چھوٹا بھائی، ان سب کی آنکھوں کا تارا خدا کو پیارا ہو گیا اور غریبوں کا دوست آج انعام یافتہ گروہ میں شامل ہو کر سب بھائی بہنوں کا سر فخر سے بلند کر گیا۔ آپ سب کو مبارک ہو کہ آپ کے بھائی شہید محترم نے سر سوغات میں پیش کر کے اپنی قوم کو جو تحفہ دیا ہے، وہ لاثانی تھا اور صبا اعجاز کہتی ہیں کہ میرے پیارے امام نے بھی میری ماما کے نام خط لکھا۔ اس میں بہت تسلی دی اور مبارک بھی دی کہ "یہ بہت بڑا مرتبہ ہے جو قسمت سے ملتا ہے۔ بہت سے لوگ اسی انتظار میں رہے ہیں مگر شہادت نصیب نہیں ہوئی۔"

---

[1] نوائے درد، صفحہ ۱۲۶

حضرت اقدس بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ ''یعنی سچے مخلص لوگوں کا سر اس لئے تبر کے نیچے ہوتا ہے کہ قوم کا سر جو مشکلات میں مبتلا ہے، رہائی پائے۔''

اے مادرِ محترم! ملک اعجاز صاحب! آپ کو قوم سلام پیش کرتی ہے کیونکہ آپ کی اعلیٰ تربیت نے قوم کا فخر سے سر بلند کر دیا ہے۔ آپ کے بیٹے کی قربانی اور جانثاری نے صداقتِ مسیح موعود علیہ السلام پر اپنے خون سے مہر ثبت کر دی ہے۔

کیونکہ

دین کی محبت اور دین کے لئے قربانی کرنا صرف ماں ہی سکھلا سکتی ہے اور جب وہ یہ نسخہ اس کے پلے باندھ دیتی ہے اور کہتی ہے کہ میرے بچے اگر تیرے خون سے میرا دین رنگ و نور سے بھر سکتا ہے تو یہ سودا مہنگا نہیں، آگے بڑھ اور دین کے لئے قربان ہو جا تا آنکہ میری قوم کا سر بلند ہو جائے اور تیرا خون اس کی سچائی کی تصدیق کر دے۔ اگرچہ بچہ قربانی کی روح سے بھی واقف نہیں ہوتا مگر ماں اسے خدا کے دین اور انسانیت کی محبت سے روشناس کرواتی ہے۔ ہوتے ہوتے بچہ ایک دن ان مقدس جذباتِ محبت سے سرشار ہو کر ہر ممکنہ کام کرتا ہے، وہ خدا کے لئے زندہ رہتا ہے اور خدا کے لئے مرجاتا ہے۔ وہ دین کے لئے زندہ رہتا ہے اور دین کے لئے ہی مرجاتا ہے کیونکہ یہ چاشنئ محبت شیرِ مادر کے ساتھ ہی پلا دی گئی تھی۔ اور اسماعیلی قربانی کا رنگ اسے تربیت کے ذریں اصولوں کے ساتھ پڑھا دیا تھا۔ پھر ایک دن اس نے خدا کی خاطر اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ پس اے ملک اعجاز احمد شہید، آپ بیشک خوش نصیب ہیں کہ آپ کی بیٹی صبا اعجاز صبر و ہمت سے کہتی ہے کہ ''میں بھی اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ ایک شہید کی بیٹی ہوں اور میری ماما ایک شہید کی بیوی ہیں۔ جس کا مرتبہ بہت بلند

ہے۔ جس کے لئے ساری جماعت کی دعائیں اور خاص کر میرے پیارے امام کی نظر ہے اور خاصل دعائیں ہیں۔ الحمدللہ! جاتی دفعہ بابا جانی خود بھی بلند ہو گئے اور ہمیں بھی بلند کر گئے۔

اے خدا تیرے لئے ہر ذرہ ہو میرا فدا
مجھ کو دکھلا دے بہار دین کہ میں ہوں اشکبار

جیو تو کامران جیو، شہید ہو تو اس طرح
کہ دین کو تمہارے بعد عمرِ جاوداں ملے

حلاوتِ ایمان: پس جب قضاوقدر غالب ہوتی ہے تو شہداء کے ذمرے میں شامل ہونے والے ہر شہید کی دل کی آواز یہی کہتی ہے۔

فَاقْضِ مَاۤ اَنْتَ قَاضٍ، اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا [1]

یعنی جو تیرا زور لگتا ہے کر لے تو صرف یہ دینا کی زندگی کو ہی ختم کر سکتا ہے)۔ اور آج شہید اعجاز ملک کی آواز فضا میں گونجی تھی۔ یہ جرأتِ ایمانی کا اقرار ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے ساحروں نے بے دھڑک فرعون کے سامنے کر ڈالا تھا۔ لیکن آج اس کیفیت کو ہم ہر شہید کی زندگی میں نمایاں طور پر دیکھتے ہیں۔ نہ صرف بزرگ اور معمر لوگ اپنے سچے دل کی حلاوتِ ایمانی کے معراج تک پہنچ چکے ہیں بلکہ باوقار اور ابرار خدام بھی اپنے خدا کا دامن تھامنے کے لئے ہر بلا سے ٹکرا جانے کو تیار ہیں۔ بلکہ وہ ٹکرائے اور آگ میں ڈالے گئے مگر ان کی ایمانی کیفیت نے آگ ٹھنڈی کر دی جوان کے لئے سلامتی کا پیغام لے آئی۔ الحمد للہ.

اس حلاوتِ ایمان کی کیفیت کو حضرت خلیفۃ المسیح ثانی المصلح موعودؓ کس

---

[1] سورۃ طٰہٰ، آیت ۷۳

عمدگی سے بیان فرماتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم کو خدا مل جائے اور اپنے ایمان کے نتیجہ میں اور ہر قسم کے خطرات مول لینے کے بعد **خدا کا دامن** ہمارے ہاتھ میں آجائے تو ہمیں بڑی سے بڑی مصیبت کی پرواہ نہیں ہوسکتی۔ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو سچے دل کے ساتھ **حلاوت ایمان** نصیب ہوجائے تو اس کے بعد آگ میں بھی ڈال دیا جائے تو وہ اس کو بہت زیادہ پسند کرے گا بہ نسبت اس کے کہ وہ اپنے عقیدہ کو چھوڑ دے۔''

اللہ تعالیٰ سے محبت: اللہ تعالیٰ محسن ہے اور اپنے بندوں سے پیار کرتا ہے۔ تبھی تو ان کے لئے راستے متعین کرتا ہے، ان کی زندگی کا لائحہ عمل تیار کرتا ہے۔ پھر اتباع کرنے والے کے لئے انعام بھی مقرر فرماتا ہے اور پھر ان کو **آزماتا** بھی ہے۔ پھر آزمائش کے نتیجہ میں انعامات کی بارش بھی کرتا ہے اور ایسے انعامات کی بارش کرتا ہے کہ جن کو لوگ جنگوں میں دشمنوں کی صفوں کو چیر کر ڈھونڈتے ہیں لیکن کچھ لوگ گھر بیٹھے ہی وہ انعامات پا لیتے ہیں۔ مگر تقویٰ شرط ہے۔ محبتِ الٰہی شرط ہے اور اتباعِ رسولؐ شرط ہے۔

چنانچہ محبت و وفا کے پیکر ملک اعجاز شہید خدا سے سچی محبت رکھتے تھے اور خدا تعالیٰ کی محبت کا جذبہ جب بیدار ہوجائے تو اس کی شدت کم نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسی آگ ہے جو کسی دل میں لگ جانے سے اس کا بڑھ جانا تو لازمی ہے، کم ہونا ناممکن ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تُو ایک ہاتھ میری طرف آگے بڑھائے گا تو میں دس ہاتھ تیری طرف بڑھاؤں گا۔ پس یہ لامتناہی سفر ہے اور واپسی کہیں سے نہیں ہوتی بصورت دیگر ہلاکت ہی مقدر ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا خدا تعالیٰ کے پا جانے کے بعد بندہ خدا کا ہوجاتا ہے۔ اس کا دل خدا کا دل ہوجاتا

ہے، اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہو جاتا ہے۔ قارئین! آپ کو بخوبی علم ہوگا کہ انسان کئی دعائیں خدا سے مانگتا ہے۔ کچھ قبول ہوتی ہیں اور کچھ ردّ ہو جاتی ہیں مگر ایک دعا ایسی ہے جو دربارِ الٰہی سے کبھی ردّ نہیں کی جاتی اور وہ دعا محبت الٰہی کی طلب ہے۔ یہی طلب الٰہی ضرور قبولیت حاصل کر لیتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ محبت کی طلب کے جذبے کو کبھی ردّ نہیں کرتا۔ بندے کو اپنا قرب عطا کر دیتا ہے۔ اور یاد رہے کہ محبت ہمیشہ قربت چاہتی ہے اور قربت سے ہی محبت پرکھی جاتی ہے۔ بیشک سب برکت دنیا میں خدا تعالیٰ کے تعلق سے ہی پیدا ہوتی ہے کیوں کہ وہ آسمانوں کا نور ہے۔ اور وہ ہی زمین کا بھی نور ہے۔ اس نور کا تقاضا یہی ہے کہ اس کی محبت اور قربت انسان کو بھی نور ہی عطا کرے۔ پس جہاں تک اعجاز شہید محترم کی محبتِ الٰہی اور قربتِ الٰہی کا تعلق ہے تو انہوں نے اپنی محبت ثابت کرنے کے لئے تو اپنا سر ہی چندہ میں پیش کر دیا اور خدا تعالیٰ کے احسان کا جواب احسان سے دیا اور یہی اعجاز صاحب کی محبت کا مثالی اور واضح ثبوت ہے۔

افعال وافضال: آئیے اب آگے چل کر دیکھتے ہیں کہ محترم اعجاز شہید نے یہ قربتِ خداوندی کیسے حاصل کی اور انہیں خدا کے حضور سے قبولیت کیسے نصیب ہوئی؟

۱۔ تلاوتِ قرآن مجید

۲۔ تہجد گزاری

۳۔ اعمالِ صالحہ، خدمتِ خلق وغیرہ وغیرہ

لاریب یہ وہ اعمال ہیں جو قربتِ خداوندی کی نشاندہی کرتے ہیں مگر اعمال سے بڑھ کر فضلِ الٰہی سب سے زیادہ جاذب شے ہے۔

محترم ملک اعجاز شہید کی والدہ محترمہ جمیلہ بیگم صاحبہ بنت محترم شیخ خدا

ا۔ تفسیر کبیر، سورۃ طٰہٰ، صفحہ ۴۳۹

بخش صاحب، صحابی مسیح موعود علیہ السلام چونکہ قرآن مجید کی فیض و معرفت سے مالا مال ہیں، اس لئے انہوں نے اپنے بیٹے کو خود ہی قرآن مجید پڑھایا اور بہت محتاط نمونے سے انہیں ترجمہ سکھایا کہ وہ اکثر اپنی گفتگو میں قرآن پاک کا حوالہ پیش کرتے تھے۔ بہت روانی سے اور خوش الحانی سے روزانہ تلاوت کرتے تھے۔ محترمہ طاہرہ اعجاز کہتی ہیں کہ شہید محترم دن کا لائحہ عمل اس طرح ترتیب دیتے تھے کہ صبح اٹھ کر نماز پڑھ کر قرآن پاک کی تلاوت کرتے، پھر سیر کے لئے نکل جاتے تھے۔ وہاں سے واپس آ کر صبح کی چائے پی کر پودوں کو پانی دینا ان کا معمول تھا۔ مسواک کرنا اور پھر اپنی دوکان پر جانے کی تیاری کرنا اور ساڑھے آٹھ بجے تک دوکان پر چلے جاتے تھے۔ دوپہر ظہر کی نماز مسجد میں باجماعت پڑھ کر گھر آتے، کھانا کھا کر سو جاتے اور پھر دو گھنٹے سونے کے بعد اٹھ کر عصر کی نماز سے فارغ ہو کر چائے پیتے اور دوکان پر چلے جاتے۔ پھر بعد نماز مغرب گھر واپس لوٹ کر پڑھتے لکھتے اور پڑھاتے لکھاتے تھے۔ انہیں بہت شوق تھا کہ ان کی بیٹی صبا اعجاز ڈاکٹر بن کر دکھی انسانوں کی خدمت کرے۔"

جہاں تک نماز کے التزام کا تعلق ہے، بفضلِ خدا نماز کے بہت پابند تھے۔ کہتے تھے کہ جب ہم چھوٹے تھے تو ہماری والدہ ہمیں نماز و تلاوت کے متعلق بہت سختی سے پابند کرتی تھیں یہاں تک کہ ہمیں صبح کا ناشتہ بھی نہیں ملتا تھا جب تک کہ ہم نماز قرآن مجید نہ پڑھ لیتے۔ اور یہی وجہ تھی کہ قربانی اور محبتِ الٰہی ان کا جزو زندگی بن چکا تھا۔

اور یاد رہے کہ بچپن کی تربیت ایک بنا بنایا سانچا ہوتا ہے جس میں ڈھل کر ہر بچہ خصوصاً بیٹا اپنی اپنی جگہ اعلیٰ اقدار کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ سو محترم اعجاز ملک صاحب کو ماں کا مربیانہ ہاتھ میسر رہا۔ جس نے صبر اور درد کے ساتھ قرآن کے نور سے آپ کو منور کیا اور جب ماں قرآن مجید بچے کو پڑھاتی ہے تو ایک درد

اور محبت اس کے سینے میں پنہاں ہوتی ہے۔ اگر صبر کی چاشنی میسر آجاوے تو پھر خدا کے فضل سے ماں سے بہتر قرآن مجید کوئی استاد نہیں پڑھا سکتا۔ ملک صاحب بھی خدا کے فضل سے دن کا آغاز قرآن و نماز سے کرتے تھے اور رات کی تاریکی میں اپنی اصلاح تہجد کی نماز اور دعا و سجود سے کرتے تھے۔ وقفِ عارضی میں حصہ لینا بھی قرآن مجید سے محبت کا ثبوت ہے۔ ملک صاحب اکثر وقت عارضی میں اور دوسرے گاؤں میں جا کر وقفہ کا وقت پورا کرتے تھے اور دعاؤں اور محبتوں کے نقوش چھوڑ کر آتے تھے۔ غریبوں سے محبت کرنے والے اور ضرورت مندوں کے کام آنے والے ملک صاحب ہمیشہ گاؤں سے کامراں لوٹتے تھے۔ الحمد لله.

داعی الی اللہ: جہاں تک تبلیغ کا تعلق ہے تو عموماً وہ شخص جو لوگوں سے زیادہ روابط رکھتا ہے، تبلیغ میں کامیاب ہو جاتا ہے بشرطیکہ اس کے پاس مکمل معلومات ہوں، ایک عمدہ نمونہ ہو۔ جو اس کی ذات کے علاوہ اہل خانہ سے بھی میسر آرہا ہو۔ پھر وہ شخص حُسنِ گفتار بھی رکھتا ہو، طبیعت میں نرمی ہو، صبر و استقامت، بات سننے اور دمدعا بیان کرنے کا ملکہ ہو۔ خوش قسمتی سے ملک اعجاز شہید میں یہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ وہ اپنے گھر، محلّہ، شہر در شہر بطور محبت کے سفیر یکساں مقبول تھے۔ وہ ہمیشہ مسائل کا مطالعہ کرتے تھے۔ اختلافی مسائل پر انہیں مکمل عبور حاصل تھا۔ چونکہ سیمنٹ کے ڈیلر تھے، اس لئے عوام سے بہت وسیع روابط تھے۔ اسی میل و ملاقات کی بناء پر اکثر وہ اپنا مدعا انہیں تھما دیتے تھے اور اپنا نقطۂ نظر پیش کر کے اپنی ذات میں مطمئن ہو جاتے تھے۔ جماعت وزیر آباد سے تعلق تھا۔ پہلے وہاں قائد مجلس ہوا کرتے تھے۔ پھر ضلع کے قائد ہوئے۔ اب انصاراللہ کی کمیٹی کے ممبر تھے۔ سیکرٹری تحریک جدید کی خدمات بجالاتے تھے۔ اپنی دوکان پر لوگوں کو الفضل سناتے تھے۔ پھر گھر آکر دوستوں کے مسائل حل کیا کرتے تھے۔ پچھلے سال پورے وزیر آباد میں اعجاز صاحب کی بیعتیں سب سے

زیادہ تھیں۔انہوں نے ایک پورے خاندان کی بیعت کروائی۔چندہ میں بھی خدا کے فضل سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔(طاہرہ اعجاز)

ازدواجی زندگی: ان کی زندگی بہت خوشگوار تھی، بہت ہمدرد، محبت کرنے والے شوہر تھے۔نہ ہی کبھی انہیں شکایت کا موقع ملا تھا اور نہ ہی مجھے کبھی ایسا اتفاق ہوا۔بہت پُرسکون زندگی تھی۔شادی کے ۲۲ سال یوں ہی گزر گئے۔آج احساس ہوتا ہے بہت جلد گزر گئے۔انہوں نے ہر طرح سے میرا خیال رکھنا۔

محترم شیخ خدابخش صاحب کا نواسہ ملک اعجاز جب رشتۂ ازواج میں داخل ہوئے تو خدا تعالیٰ نے انہیں نہایت مخلص اور خلافت سے سچی وابستگی رکھنے والے گھرانے کی بیٹی محترمہ طاہرہ صاحبہ عطا کردی جو ان کی رفیق حیات ۲۲ سال تک رہیں۔طاہرہ صاحبہ ملک محمد شریف صاحب جو جماعت احمدیہ راولپنڈی کے ایک معزز بزرگ کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں، ان کی بیٹی ہیں۔محترم ملک محمد شریف صاحب تاحیات سیکرٹری اصلاح وارشاد پنڈی کا اہم فریضہ ادا کرتے رہے۔یہی وجہ ہے کہ اس گھر کا ماحول نکھرا ہوا تھا اور خدا کے فضل وکرم سے نکھرانے والا بھی تھا۔

شہادت کا تفصیلی بیان وآلۂ قتل: وزیرآباد کا چکر لگا تاہوں: یہ خاندان چونکہ ساری عمر وزیرآباد سے ہی منسلک تھا اس لئے ملک اعجاز احمد آف وزیرآباد کہلاتے تھے۔اور خدا کی قدرت کہ ساری حیاتی وزیرآباد میں گزار دی۔لیکن شہادت سے ایک ماہ پہلے راولپنڈی فیملی سمیت منتقل ہوگئے تھے۔طاہرہ اعجاز لکھتی ہیں کہ چونکہ اب ہم پنڈی چلے گئے تھے، دو دن کے لئے وزیرآباد آئے۔کسی پروگرام کے بغیر انہوں نے ایک دن کہا کہ وزیرآباد کا چکر لگا آؤں۔میں خاموش رہی اور وہ تیار ہوگئے۔وزیرآباد آئے۔ہمارا فون خراب تھا۔وہاں پہنچ کے بعد ہم سے کوئی رابطہ نہ ہوسکا۔ یکم دسمبر ۱۹۹۸ء صبح معمول کے مطابق تیار ہوئے

بلکہ جلدی تیاری کر لی۔ محترمہ حمیدہ بیگم صاحبہ، ان کی چھوٹی بہن ان کے پاس آئی ہوئی تھیں، رات بھر ان کے ساتھ بہت خوش باش باتیں ہوتی رہیں۔ اس نے فون سے بہت کوشش کی کہ بات ہو جائے مگر جاتے وقت میں نے کہا تھا کہ میں آپ کے ساتھ وزیر آباد کچھ زیور لینے کے لئے جانا چاہتی ہوں۔ انہوں نے کہا کہ میں جلدی آ رہا ہوں، تم بعد میں آ جانا چنانچہ وہ سیدھے کسی دوست کے پاس گئے۔ وہاں سے اپنی دوکان پر آئے۔ تقریباً ۹ بجے کا وقت تھا، اخبار ہاتھ میں تھا، چابی بھی ہاتھ میں ہی تھی کہ نوکر سے کہنے لگے کہ دفتر سے مجھے کچھ پکڑاؤ۔ وہ اندر گیا۔ ایک آدمی آیا، اس نے پوچھا کہ ملک اعجاز کون ہے؟ ملک صاحب نے مڑ کر دیکھا اور کہا، میں ہوں، کیا بات ہے؟ اس نے پستول سے فائر کر دیا۔ دو تین گولیوں کے بعد وہ گر گئے اور وہ شخص بھاگ گیا۔ گو لوگ پیچھے بھاگے مگر وہ نکل گیا۔ نوکر جس نے دیکھا، وہ بتلا رہا تھا کہ ملک صاحب اٹھے، زخم کو دیکھا، گولی ایک سائیڈ سے گزر کر دوسری سائیڈ سے نکل گئی۔ ایک گولی ٹانگ پر لگی تھی، مگر وہ سائیڈ سے گزر گئی، زخم نہ ہوا۔ شلوار کو جھاڑا اور گولی نیچے گر گئی۔ اپنے زخم کو ملک صاحب نے دیکھا اور صرف اتنا کہا۔ ظالم نے بہت ظلم کیا ہے اور گر گئے۔ نوکر نے فوراً اٹھایا اور ہسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر نے دیکھا اور کہا، فکر کی کوئی بات نہیں، خون کی ضرورت ہے۔ خون آ بھی گیا مگر خون لگنے سے پہلے وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

وزیر آباد کا چکر لگا آنے والے ملک اعجاز کی شہادت مقدر تھی جو زمین وزیر آباد کے لئے لکھی گئی تھی۔ اے ارضِ وزیر آباد تیرے باسیوں نے ایک عظیم بابا جانی کو ان کی بیٹی صبا اعجاز سے جدا کر دیا۔ بیشک وہ رحیم شخص تھا۔ مخلوقِ خدا سے محبت ہی تو انہیں ہمیشہ کی زندگی دے گئی۔ وہ لوگوں سے محبت کرتے تھے۔ وہ بلا امتیاز چھوٹے بڑے، امیر و غریب اور اپنے پرائے سب سے پیار کرتے تھے۔ صبا کہتی ہیں، میرے بابا جانی، ایک عظیم انسان تھے، شفیق باپ تھے، شفیق شوہر

تھے۔ خاندان میں کوئی مسئلہ ہوتا تو سب ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ پورے خاندان کے لئے ایک گھنے سایہ کی مانند تھے۔ ہر ایک سمجھتا گویا مجھ سے ہی زیادہ پیار ہے۔۔۔آپ کا دل محبت واخوت سے بھرا ہوا تھا۔ نہایت ہمدرد انسان تھے۔ بردباری اور تحمل آپ میں کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ حُسنِ خلق اور حُسنِ ظن کی وجہ سے خاندان بھر کے لئے لاثانی تھے۔۔۔خاندان حتیٰ کہ غیر از جماعت لوگوں میں بھی بہت مقبول تھے۔ مخلوقِ خدا کی حاجت روائی کے لئے ہر وقت کوشاں رہتے اور اس کارِ خیر کے لئے اپنے آرام کی بھی پرواہ نہ کی۔ ہر وقت لوگوں کے کاموں میں مصروف رہتے۔ جب ہم کہتے کہ آپ آرام نہیں کرتے، اپنے اتنے کام رکے پڑے ہیں اور اتنے ہی لوگوں کے تو ہمیشہ ہنس کر ٹال دیتے اور کہتے۔

انسان کی زندگی کا کیا مقصد ہے، اوروں کے کام آنا۔

ہو پرکھ اہل وفا کی کس طرح سے پھر اگر
راہ ہستی میں جو دشتِ کربلا کوئی نہ ہو

عمل تدفین: ملک اعجاز احمد شہید کی نماز جنازہ ڈھونیکی میں محترم طاہر صاحب مربی سلسلہ عالیہ احمدیہ ضلع گوجرانوالہ نے پڑھائی جس میں کثیر تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ شام ساڑھے سات بجے ربوہ کے لئے روانہ ہوئے۔ طاہرہ صاحبہ اور صبا صاحبہ جنازہ کے ساتھ اپنے باباجانی کے آخری سفر میں شامل تھیں۔ سارے ربوہ میں تمام مساجد میں اطلاع ہو چکی تھی۔ صبح نو بجے جنازہ دارالضیافت سے لائبریری میں پہنچا جہاں کثیر تعداد میں لوگ جمع تھے، سکول کے بچے قطاروں میں کھڑے تھے اور باری باری سب نے شہید محترم کا چہرہ دیکھا۔ پھر یہ جنازہ بزرگوں اور پیاروں کی دعائیں سمیٹتا ہوا قبرستان عام کی طرف روانہ ہوا جہاں قطعۂ شہداء میں دفن کیا گیا۔ یہاں ربوہ میں نماز جنازہ محترم مرزا خورشید احمد صاحب نے پڑھائی تھی اور آخری دعا بھی انہوں نے کی۔

اور اب صبا اعجاز آخر دعا پیش کرتی ہیں، خدا تعالیٰ قبول فرمائے۔
حضرت اماں جانؓ نے فرمایا جو مجھے آج بھی یاد ہے کہ اے خدا! وہ تو ہمیں چھوڑ گئے تو ہمارا ساتھ نہ چھوڑنا۔ اے خدا! تو ہمیں اپنی پناہ میں رکھنا اور ہمیں صبر کی طاقت اور ہمت دینا۔ آمین۔ ماما میرے لئے اور میں اپنی پیاری ماما کے لئے باعث راحت بنوں اور اپنے بابا جانی کی خواہشات کے مطابق پڑھائی کروں۔ آمین۔ میری ماما جو غم سے نڈھال ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کی صحت و زندگی میں برکت ڈالے اور مجھے ان کی خدمت کی توفیق عطا کرے اور میں ان کی آنکھوں کے لئے ٹھنڈک بنوں۔ آمین۔

پیاری صبا اعجاز! خدا تعالیٰ تمہاری دعائیں قبول فرمائے، بیٹی تم جانتی ہو کہ:

> ''ان زندہ شہیدوں کی روحیں قفسِ عنصری سے پرواز کر کے جب اڑتی ہیں تو وہ سبز پرندوں کی صورت میں جنت کی سیر کرتی ہیں۔ اور عرشِ الٰہی کی قندیلیں ان کو نشیمن بنتی ہیں۔۔۔ اور بعض سعید روحیں تو یہاں سے نکل کر فرشتوں کی صف میں داخل ہو جاتی ہیں۔'' [1]

---

[1] سیرۃ النبیؐ، جلد چہارم، ص ۱۷۰

اک نظر میں

نام	:	ملک اعجاز احمد شہید
والد صاحب کا نام	:	ملک عنایت اللہ صاحب
جائے پیدائش	:	ڈھونیکی تحصیل، وزیر آباد
عمر	:	--- تا یکم دسمبر ۱۹۹۸ء
تعلیم	:	انٹرمیڈیٹ
پیشہ	:	تجارت، سیمنٹ کا کاروبار
لواحقین	:	بیوہ اور ایک بیٹی
قد و قامت	:	---
لباس	:	شلوار قمیض
اوقاتِ کار	:	صبح نماز و تلاوت کے بعد سیر پر جاتے اور زیادہ وقت تبلیغ میں گزارتے
تاریخِ شہادت	:	دسمبر ۱۹۹۸ء
عہدہ بوقت شہادت	:	قائد ضلع
آلۂ شہادت	:	پستول
نمازِ جنازہ	:	محترم مرزا خورشید صاحب
آخری آرامگاہ	:	ربوہ
شمائل	:	داعی الی اللہ، غرباء نواز، امام وقت کا اطاعت شعار، ملنسار، تہجد گزار وجود تھے۔

فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ

(الفجر)

یعنی اے پاکیزہ روح، تو مرا سچا اور فرمانبردار ہوتے ہوئے اس باغ میں داخل ہو جا جس میں، مَیں بھی تیرے ساتھ ہوں گا۔

اس میں دو وجوہ بتائی ہیں کہ مومن جنت میں کیوں داخل ہوگا۔ ایک تو اس لئے کہ وہ مرا فرمانبردار ہوگا۔ اور دوسرے میں اور وہ اکٹھے اس میں ہوں گے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ مومن کو گویا یہ بتاتا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ تو جنت کی خاطر جنت میں نہیں جائے گا بلکہ میرے قرب کی وجہ سے جائے گا۔ اس میں جنت کے انعام کو ایسا حقیر بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میں بندہ سے یہ نہ کہوں گا کہ اس میں داخل ہونے میں میری اطاعت ہے، وہ داخل نہ ہوگا۔ دوسرے جب تک میں اسے یہ نہ کہوں گا کہ جنت اصل مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود اس میں داخل ہونے کا یہ ہے کہ تو میرے ساتھ رہے گا۔ وہ داخل نہ ہوگا۔ تو اس چھوٹی سی آیت میں اللہ تعالیٰ نے عشق و محبت کے بے انتہا باب کھول دیئے ہیں۔[1]

---

[1] خطبات محمود، جلد اول، ص ۲۷۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہٗ ونصلی علی رسول کریم

هوالناصر، خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

محترم محمدؐ ایوب صاحب شہید

بلانے والا ہے سب سے پیارا
اُسی پہ اے دل تو جان فدا کر

پیشتر اس کے کہ ہم اپنی قوم کے اس **جانثار** سے ملیں، آیئے پہلے شہادت و جانثاری کے فلسفے پر کچھ غور کر لیتے ہیں کہ خدا کی راہ میں جان کی بازی لگانے والے کے لئے اس کے لواحقین کے لئے، قوم کے لئے اور دین کی احیاء کے لئے انعامِ شہادت میں کتنی برکات پنہاں ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَا تَقُولُو لِمَن يُقتَلُ فِى سَبِيلِ اللّٰهِ اَموَاتٌ ط بَل اَحيَآءٌ وَّلٰكِن لَّا تَشعُرُون [1]

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مارے جائیں، ان کے متعلق یہ مت کہو کہ وہ مردہ ہیں (وہ مردہ نہیں) بلکہ زندہ ہیں، مگر تم نہیں سمجھتے۔

اس آیت کریمہ میں ہم نے موضوع کے اعتبار سے اس بات پر غور کرنا ہے کہ جو لوگ راہِ خدا میں مارے جاتے ہیں، وہ وفات کے بعد زندہ کن معنوں میں ہوتے ہیں۔

---

[1] سورۃ البقرہ، آیت ۱۵۵

یاد رہے کہ اہل عرب میں یہ رواج تھا کہ جو لوگ مارے جائیں، ان کا بدلہ ضرور لیا جائے۔ اور اگر بدلہ نہ لیا جا سکے تو انہیں وہ مردہ کہتے تھے اور اگر بدلہ لے لیا جائے تو وہ ان کو زندہ کہتے تھے۔ اس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہوئے کہ ”جو مسلمان شہید ہو گئے ہیں، تم ان کو مردہ مت کہو، وہ خدا تعالیٰ کے زندہ سپاہی ہیں اور خدا تعالیٰ خود ان کا بدلہ ضرور لے گا۔“ اس تفسیر وتشریح میں:

۱۔ حضور خلیفۃ المسیح الثانی المصلح موعودؓ فرماتے ہیں کہ جس شخص کا کام جاری رکھنے والے لوگ پیچھے رہ جائیں یعنی پیچھے باقی ہوں، اس کی نسبت بھی کہتے ہیں کہ مامات کہ وہ مرا نہیں یعنی زندہ ہے اور مردہ اسے کہتے ہیں جو مرے اور اس کا کوئی اچھا اور نیک قائم مقام نہ ہو۔۔۔۔ پس وہ قوم کبھی نہیں مرتی جس کے افراد اپنے شہداء کی جگہ لیتے جائیں جو قوم اپنے قائمقام پیدا کرتی چلی جاتی ہے، وہ خواہ کتنی ہی چھوٹی ہو، اُسے کوئی نہیں مار سکتا۔ کیونکہ ہر قدم پر پہلے سے زیادہ قربانی کرنے والے لوگ موجود ہوتے ہیں اور جو قوم قربانی کے اس مقام پر پہنچ جاتی ہے، اسے کوئی تباہ نہیں کر سکتا۔

۲۔ خدا تعالیٰ کی راہ میں قتل کیا ہوا شخص رنج وغم سے آزاد ہوتا ہے کیونکہ وہ اس زندگی سے اعلیٰ زندگی پا لیتا ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے اسے انعامات مل رہے ہوتے ہیں۔ پھر انہیں مردہ کہنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

۳۔ شہید کو ایک اعلیٰ حیات مرنے کے بعد ہی مل جاتی ہے جبکہ دوسرے لوگوں کو عرصہ تک درمیانی حالت میں رہنا پڑتا ہے۔ بعض حدیثوں سے معلوم ہوا ہے کہ شہید تین دن کے اندر اندر زندہ ہو جاتا ہے اور اس کمال کو حاصل کر لیتا ہے جسے دوسرا شخص ایک لمبے عرصے میں حاصل

کرتا ہے۔۔۔یاد رہے کہ مرنے کے بعد زندگی تو مومن اور کافر دونوں کو حاصل ہوگی لیکن شہید چونکہ خدا تعالیٰ کی خاطر اپنی زندگی دے دیتا ہے، اس لئے اسے مرنے کے بعد ایک اعلیٰ حیات مل جاتی ہے۔

۴۔ شہید کے اعمال کبھی ختم نہیں ہوتے کیونکہ وہ زندہ ہے اور اس کے اعمال ہمیشہ بڑھتے رہتے ہیں۔اس نے خدا کے لئے اپنی جان قربان کر دی اور خدا نے نہ چاہا کہ اس کے اعمال ختم ہو جائیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کتنی لطیف بات ہے کہ شہادت کا مقام حاصل کرنے والوں کو دائمی حیات حاصل ہو جاتی ہے۔ [1]

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی اس تمام تفصیل کی ایک بہت واضح مثال تحریر فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ حدیثوں میں آیا ہے کہ رسول خدا ﷺ نے ایک دفعہ حضرت جابر بن عبداللہؓ کو دیکھا کہ وہ بہت افسردہ اور غمگین کھڑے ہیں۔آپ نے فرمایا، تم کیوں غمگین کھڑے ہو؟ انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہؐ! میرے والد جنگِ احد میں مارے گئے ہیں اور انہوں نے اپنے پیچھے بہت بڑا عیال اور قرضہ چھوڑا ہے، اس لئے میں افسردہ ہوں۔ رسول خدا ﷺ نے فرمایا ''کیا میں تمہیں خوش خبری نہ دوں کہ موت کے بعد تمہارے والد صاحب کے ساتھ کیا ہوا؟ وہ خدا تعالیٰ کے سامنے جب زندہ ہو کر حاضر ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے خوش ہو کر بالمشافہ کلام کیا اور فرمایا۔ ''اے میرے بندے، تُو مجھ سے کچھ مانگنا چاہتا ہے، مانگ، میں تجھے دوں گا۔'' انہوں نے عرض کیا، حضور! میری صرف اتنی سی خواہش ہے کہ میں پھر زندہ ہو کر دنیا میں جاؤں اور آپ کی راہ میں پھر مارا جاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ایسا کر تو سکتا ہوں مگر میں یہ قانون بنا چکا ہوں کہ جو ایک دفعہ مر جائے، اسے دنیا میں واپس نہیں بھیجوں گا۔''

[1] تفسیر کبیر البقرہ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو سچا ایمان لاتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ہمارا مرنا قوم کو زندہ کرنے کا موجب ہوگا اور آخرت میں بھی ہمارے لئے بہت بڑے ثواب کا موجب ہوگا، اس لئے وہ موت کو کوئی خوف والی چیز نہیں سمجھتے۔ وہ خدا تعالیٰ کی راہ میں جان دے کر بھی زندہ ہیں اور جانیں نہ دینے والے زندہ ہو کر بھی مردہ ہوتے ہیں۔

پس ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ خدا کی راہ میں جان دینے والا ابدی حیات حاصل کر لیتا ہے اور وہ نہ صرف خود زندہ رہتا ہے بلکہ اپنی قوم کو بھی زندگی عطا کرتا ہے۔ اس کی قوم قربانی کے نتیجہ میں بڑھتی ہے، پھلتی ہے، پھولتی ہے اور اعلیٰ درجے کی زندگی پا کر تمام الٰہی انعامات سے متمتع ہو جاتی ہے۔ الحمد للہ علی ذالک۔

<u>نعم العبد:</u> قوم کو زندہ رکھنے والا جانثار ایک ایسے خاندان کا چشم و چراغ تھا کہ جب اس خاندان کے صحنِ گلشن میں احمدیت یعنی حقیقی اسلام کا پودا لگا تو مخالفت کے طوفان نے اسے چہار طرف سے گھیر لیا۔ خاندان کے ہر فرد نے منہ موڑ لیا۔ گھر والوں نے ہی اپنے نور نظر پر رحم کے دروازے بند کر دیئے اور بالآخر خاندان کے بزرگوار دادا شیخ عزیز الدین صاحب نے جائداد سے عاق کر کے گھر سے لاتعلق ثابت کر دیا اور یہ مہر لگا دی کہ مہدی آخر زماں سے تعلق رکھنے والے افراد کا اس گھر سے کوئی تعلق برداشت نہیں کیا جا سکتا مگر شیخ عزیز الدین نہیں جانتے تھے کہ خدا تعالیٰ کی مشیت اسی پسرِ محترم شیخ نیاز الدین صاحب سے احمدیت کے لئے قربانی کرنے والا وجود پیدا کر دے گی۔ اے! شیخ عزیز الدین صاحب خدا تعالیٰ کی تدبیریں اور مصلحتیں کیا کیا کام کرتی ہیں۔ خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو چھوڑا نہیں کرتا۔ آپ کے بیٹے نیاز الدین صاحب نے وقت کی پکار سنی اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو شناخت کیا اور خدا تعالیٰ نے مہدی علیہ السلام کی

صداقت کو منوانے کے لئے دیر نہیں کی بلکہ اپنے فضل وکرم سے ۱۹۳۷ء میں شیخ نیاز الدین صاحب کو ایک بیٹا عطا کیا جس نے نہ صرف اپنے باپ کا نام روشن بلکہ وہ احمدیت کا پودا جو شیخ نیاز الدین نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر کے شیخ خاندان میں لگایا تھا۔ ثمر آور ہوا بلکہ شیریں ثمرات سے بھر گیا۔

چنانچہ کیا اور کیسے ہوا؟

کہ شیخ نیاز الدین صاحب نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی اطاعت وفرمانبرداری کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ خلافت کی برکات کو اپنی بساط پر سجالیا اور وہ دن بھول گئے کہ جائداد سے والد صاحب نے عاق کیا تھا۔ ان کی کائنات ہی **وابستگی خلافت بن** گئی۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ زمانے کو امام کی ضرورت تھی، سو یہ حضرت میرزا غلام احمد مسیح موعود علیہ السلام کی آمد سے پوری ہوئی۔ اور نصیب والے نیک فطرت لوگ آپ کے قدموں میں جا گزیں ہوئے۔ انہی خوش نصیب لوگوں میں محترم شیخ عمر دین صاحب بھی شامل تھے جن کو خدا تعالیٰ نے توفیق عطا کی اور انہوں نے اپنے آقا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے رفقاء میں اپنا مقام بنالیا۔ چنانچہ خدا تعالیٰ کسی کا احسان رکھا نہیں کرتا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے شیخ نیاز الدین صاحب پر اپنا فضل کیا اور شیخ عمر دین کی بیٹی محترمہ امتہ الرشید صاحبہ کو آپ کی جیون ساتھی بنا دیا۔ اور اس طرح آپ اس گھرانے سے منسلک ہو گئے جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے قریبی حلقہ احباب کا گھرانہ تھا۔

چنانچہ یہ گھرانہ دھرم سالہ میں رہائش پذیر تھا کہ خدا تعالیٰ نے انہیں یعنی شیخ نیاز الدین صاحب اور محترمہ امتہ الرشید صاحبہ کو مئی ۱۹۳۷ء میں ایک بیٹا عطا کیا جس کا نام انہوں نے محمد ایوب اعظم تجویز کیا۔ جو بیشک بعد میں صبر وہمت میں ایوب ہی ثابت ہوا۔

چونکہ ایوب صاحب کی والدہ محترمہ ایک مخلص صاحبِ دین باپ کی بیٹی

تھیں، جنہوں نے ہر ممکن سعی کر کے اپنی بیٹی کو زیورِ اخلاق اور عظمتِ دین سے مزیّن کیا ہوا تھا۔ یاد رہے کہ جن بیٹیوں کو حضرت امام مہدی علیہ السلام کے نقش قدم پر چلنے والے باپ مل جائیں، ان پر خدا تعالیٰ کے فضلوں کی بارش ہوا کرتی ہے اور دین کے نور سے ان کی اولاد منور ہو جاتی ہے۔

چنانچہ ایوب صاحبہ کی والدہ امتہ الرشید صاحبہ کی گود اپنے بیٹے کے لئے ایسا درخشندہ گہوارہ ثابت ہوئی کہ ابتدائی دور میں ہی انہوں نے اپنی تمام توجہ اپنے بیٹے ایوبؔ کی تعلیم و تعلم میں مرکوز کر دی اور اپنے بچے کو ہر لحاظ سے تراشا کہ ان کی تربیت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور اپنے بیٹے کو B.Sc تک تعلیم دلوائی۔

محترمہ امتہ الرشید صاحبہ نے اپنے بچے میں قربانی، محبت، اطاعت اور سچائی کا جذبہ کُوٹ کُوٹ کر بھر دیا اور خدا تعالیٰ کے فضلوں نے ان کی دعائیں اور کوششیں قبول کیں کہ ہر مقام پر جب وہ آزمائے گئے، تو وہ سرخرو ہو کر سربلند ہو گئے۔

محمد ایوب اعظم دھرم سالہ میں پیدا ہوئے تھے مگر اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد واہ کینٹ آ گئے اور یہاں آ کر آرڈیننس فیکٹری واہ میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہی ان کی پہلی ملازمت تھی جس میں ترقی کرتے کرتے وہ خدا کے فضل سے مینیجر ورکس ہو گئے۔

مشیت ایزدی جب کارفرما ہو تو راستے ہموار ہو ہی جاتے ہیں۔ چنانچہ خدا کا فضل و کرم ہوا کہ ایوب صاحب کی شادی ایک مخلص احمدی گھرانے میں ہونا قرار پائی۔ یہ شادی خدا کی عنایات کا موجب ہوئی۔ ۱۹۶۵ء دسمبر کو خدا نے محترمہ بشریٰ ایوب صاحب کو محترم ایوب اعظم کا ہمسفر بنا دیا۔ یہ گھر ہنسی خوشی اپنی زندگی کے شب و روز بسر کرتا رہا اور ایوب صاحب اپنی ذمہ داریاں گھریلو اور

دفتری نبھاتے چلے گئے۔ خدا تعالیٰ نے اس خاندان کو بشریٰ جیسی صابر و شاکر فرمانبردار ساتھی عطا کی جو محترم محمد افضل منہاس صاحب رجسٹرار ہائی کورٹ کی دختر نیک اختر ہیں۔ وہ بہت دیندار اور خلیق انسان ہیں جو کہ محنت کی بناء پر تمغۂ خدمت سے نوازے گئے ہوتے ہیں۔ جماعتی لحاظ سے محمد افضل منہاس صاحب نے اپنی بیٹی بشریٰ صاحبہ کی تربیت بہت اعلیٰ رنگ میں کی ہوئی ہے۔ خدمتِ دین کا جذبہ رکھنے والی محترمہ بشریٰ صاحبہ اور ایوب اعظم صاحب کا یہ مثالی گھرانہ واہ کینٹ میں ۱۹۹۱ء تک دوران ملازمت رہائش پذیر ہوا۔ خدا تعالیٰ نے اس محبت کرنے والے گھرانے کو نوازتے ہوئے انہیں تین بیٹیاں اور ایک بیٹا عطا کیا۔

۱۔ بشریٰ ایوب صاحبہ بی۔اے

۲۔ بیلا ایوب صاحبہ ایم۔اے انگلش

۳۔ عفت ایوب صاحبہ زیر تعلیم

۴۔ اور ایک بیٹا ثمر ایوب صاحب، ایم۔بی۔اے۔ان شیریں ثمرات پر مشتمل یہ گھرانہ ایک مکمل سکالرز کا کارواں تھا جو صبح و شام اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ بشریٰ ایوب صاحبہ نے بچوں کی تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور ایوب صاحب اپنے بچوں کی زیادہ تر اخلاقی بلندی و عظمت کے لئے کوشاں رہتے رہے۔ گھریلو ذمہ داریوں کا جہاں تک تعلق ہے، بشریٰ صاحبہ کہتی ہیں کہ وہ ہمیشہ کام میں میری مدد کرتے اور اگر واشنگ مشین لگاتی تھی تو وہ اکثر رسی پر کپڑے ڈالتے جاتے تھے۔ کھانا پکانے میں میری مدد کرتے تھے۔ کھانے کے بہت شوقین تھے، اس لئے نئے نئے کھانے بنا لیتے تھے اور اکثر میرے ساتھ مقابلہ کر کے کھانے بناتے تھے اور بچوں کو علیحدہ لے جا کر سکھلایا کرتے تھے کہ بچو! تم کہنا کہ کھانا جو ابو نے بنایا ہے، وہی مزے دار ہے اور پھر اس طرح خوش ہوتے کہ بچوں نے میرے کھانے کی تعریف کر دی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

سیر وتفریح سے بھی شغف تھا۔ عموماً بچوں سمیت مختلف مقامات پر لے کر جایا کرتے اور وہاں بہت خوشی خوشی معلومات بھی فراہم کرتے تھے۔ اصل میں وہ ایک مجلسی شخصیت کے مالک تھے اور سیر و سیاحت میں بھی اپنا فرض ضرور پورا کرتے تھے۔ یعنی لوگوں سے روابط پیدا کر کے اپنے پیغام کو ان تک پہنچا کر خوشی محسوس کرتے تھے۔

بحیثیت داعی الی اللہ:

یہی کہا تھا میری آنکھ دیکھ سکتی ہے
تو مجھ پر ٹوٹ پڑا سارا شہر نابینا

محمد ایوب اعظم صاحب نڈر، بہادر اور بے خطر داعی تھے۔ بشریٰ ایوب صاحبہ لکھتی ہیں کہ وہ ہر Topic پر گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔ اصل میں یہ ایک حقیقت ہے کہ داعی الی اللہ کی کامیابی کا راز ہی اس بات میں مضمر ہے کہ وہ بے تھکان بولے اور دلائل حقہ کے ساتھ اپنا مافی الضمیر بیان کر سکے۔ جو بات بھی وہ کہے، حتمی اور دل پر اثر کرنے والی ہو، سطحی قطعی نہ ہو، سچائی کی منہ بولتی تصویر ہو۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام ایک **موعود صداقت** ہیں اور جب کوئی علمبردار اس صداقت کو لے کر بلاغت کے میدان میں اترے تو لازمی ہے کہ اس کی علمی، عملی اور روحانی کیفیت عروج پر ہو۔ اور یہی چیز اسے اس میدانِ دعوت میں کامیاب بنائے گی۔ چنانچہ ایوب صاحب شہید کو یہ معراج حاصل تھا کہ وہ غیروں کو خدا کی طرف بلاتے وقت کسی خطرے کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور گھنٹوں بوڑھوں اور جوانوں کو دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور وہ کامیاب بھی ہوئے تھے۔ ہاں، ان کی شہادت ہی تو کامیابی کی ضمانت ہے۔

ایوب صاحب کی طبیعت میں خوف وخطر کے نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ اپنے زمانہ ملازمت میں ایک بے باک داعی اور مخلص احمدی کے طور پر جانے

جاتے تھے۔ ہر شخص اس حقیقت سے واقف تھا کہ ایوب صاحب احمدیت کے سپوت ہیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ مخالفت کی وہی آندھی جو کبھی ایوب صاحب کے والد شیخ نیاز الدین صاحب کے لئے ان کے خاندان میں اٹھی تھی، آج اسی مخالفت نے ۱۹۹۱ء میں تقریباً نصف صدی بعد پھر طوفان بن کر ایوب صاحب کے گرد گھیرا تنگ کر دیا تھا مگر اب دھرم سالہ کی بجائے یہ آرڈیننس فیکٹری واہ میں مشکلات اور ابتلاؤں کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اور بالآخر مینیجر ورکس واہ فیکٹری کو ۱۹۹۱ء میں اپنے عقائد کے صدقے قربانی دینی پڑی اور وہ مردِ مجاہد دنیوی شان و شوکت کو خیر باد کہتے ہوئے سعودی عرب کی طرف نکل گئے۔ وہاں ۱۹۹۵ء تک قسمت آزمائی کی، پھر واہ کینٹ آ گئے۔

قارئین کرام! آپ کو یاد ہوگا کہ ایک دن نیاز الدین صاحب کو اپنے محبوب عقائد کی خاطر خاندان سے نکالا گیا تھا۔ آج پھر تاریخ دہرائی گئی اور باوفا، پُروقار، محنتی، دیانتدار آفیسر ایوب صاحب کو برسوں کی سرکاری خدمات سے نکال دیا گیا اور حکومتی ریکارڈ میں صرف یہ درج تھا ''وجوہات نہ معلوم ہیں۔''

لیکن وہ کیا جانیں؟

''کہ خدا کا سچا مُحب بلا کے اترنے سے اور آگے قدم رکھتا ہے اور ایسے وقت میں جان کو ناچیز سمجھ کر اور جان کی محبت کو الوداع کہہ کر اپنے مولیٰ کی مرضی کا تابع ہو جاتا ہے اور اس کی رضا چاہتا ہے اور خدا کا پیارا اپنی جان خدا کی راہ میں دے دیتا ہے اور اس سے خدا کی مرضی خرید لیتا ہے۔''

اطاعتِ امام: چنانچہ ۱۹۹۵ء میں واپس آ جانے والے ایوب صاحب صبح و شام اپنے خدا کی مرضی خریدنے کی سعی میں سرگرداں ہو گئے۔ اور انہوں نے عشقِ الٰہی کا ثبوت اپنی تمام حیاتی میں دیا اور یہی وہ سبق تھا جو ان کی والدہ محترمہ امتہ الرشید صاحبہ نے انہیں مہد سے ہی شروع کر دیا تھا اور یہ سبق لحد تک جاری رہا اور

یہ سبق تھا **اطاعت امام**۔ساری زندگی ایوب صاحب نے خلیفۂ وقت کی آواز پر لبیک کہا۔اور آپ کو ایمان تھا کہ خلافت ہی ایک بڑاانعام ہے۔خلیفۂ وقت سے پوری کوشش کے ساتھ مسلسل رابطہ رکھیں۔اور خلیفۂ وقت جس بات کی تحریک کریں،اس کا علم ہمیں کامل طور پر ہونا چاہیئے تاکہ ان تقاضوں کو ہم پورا کر سکیں۔چنانچہ ایوب صاحب کا رابطہ بذریعہ خطوط ہمیشہ جاری رہا اور آپ کی شہادت کے بعد بھی حضور ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کے حوصلہ بڑھانے والے خطوط ملتے رہے ہیں۔جن خطوط کی بناء پر تمام اہل خاندان اس ناگہانی پریشانی سے سنبھل گئے۔

مشترکہ عمل: یہاں اگر ایک حقیقت پیش کروں تو خالی از فائدہ نہ ہوگا کہ **نگینے لوگ** حصہ اول اور دوئم لکھنے کے دوران خدا کے فضل سے مجھے ۲۰۔۲۵ شہداء کی زندگیوں کا عمیق مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔دوران تحریک ایک چیز تمام شہداء کی زندگی میں مشترک نظر آئی ہے۔اگرچہ یہ بات بھی مستند ہے کہ شہداء اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قضاوقدر کے مطابق انعام پاتے ہیں۔مگر اس میں بہت حد تک خدا کے فضلوں کے ساتھ ساتھ اعمال صالحہ کا بھی دخل ہوتا ہے۔یہ ایک اعمال کی ایک ایسی Chain ہے کہ جو انعامات پر جاختم ہوتی ہے۔گو کہ انعامات کے درجات مختلف ہوتے ہیں۔

مگر

اس وقت موضوع یہ ہے کہ تمام شہداء میں دو باتیں خاص طور پر دیکھنے میں آئیں جن کی وضاحت قارئین کے لئے فائدہ مند ہوگی۔ انشاء اللہ

۱۔ تہجد

۲۔ داعی الی اللہ (پیغام مہدی)

اگرچہ ہماری سب سے پہلی دعا سورۃ فاتحہ ہمیں یہی سکھلاتی ہے کہ

''اے خداوند عالم ہمیں راہِ مستقیم پر ڈال دے، وہ راہ جو تیرے انعام یافتہ لوگوں کو نصیب ہوئی۔'' چنانچہ ایمان کی عمارت میں داخل ہونے کے بعد نماز ہی پہلی سیڑھی ہے جو ہمیں راہِ مستقیم کی طرف لے جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار بناتی ہے۔ یعنی سب سے پہلی دعا ہمیں اعمال کی ادائیگی پر متوجہ کرتی ہے اور اس ادائیگی میں سب سے پیارا عمل **تہجد** ہے جو بغیر انعام کے کسی کو نہیں چھوڑتا۔ ہر شخص اپنے مقدور بھر کچھ نہ کچھ پا ہی لیتا ہے۔ یہ ایک ایسی ارفع عبادت ہے کہ خدا تعالیٰ کے وصال کا شرطیہ نسخہ ہے اور شہید محترم ایوب صاحب محبتِ الٰہی کو سمیٹنے کے لئے ہمیشہ سے اس نسخہ پر کاربند رہے۔ وہ اتنی باقاعدگی سے تہجد پڑھتے تھے کہ گھر والوں کو بھی تلقین سے پابند کرتے تھے۔ اگر وہ نہیں اٹھتی تھیں تو منہ پر پانی ڈال کر اٹھا دیا کرتے تھے۔ وہ یہی چاہتے تھے کہ جس راہِ مستقیم کو میں نے اپنایا ہے، میرے پیارے بھی اُسی راہ پر چلیں۔ پس وہ شخص جو دن کی عبادت، کارِ خیر + حُسنِ اخلاق، امر معروف، روزہ، زکوٰۃ، نماز و قربانی کی ادائیگی کے علاوہ راتوں کے اندھیروں میں اس نور کو تلاش کرتا ہے، وہ اسے نصیب ہو جاتا ہے کیونکہ حقیقت میں وہ نور ملتا بھی رات کی تاریکیوں میں ہے۔ لہٰذا شہداء میں بوڑھے اور جوان، سب کا مشترکہ عمل **تہجد** دیکھنے میں آیا ہے۔

پیغامِ مہدی: شہداء میں دوسرا عمل مشترکہ محبتِ الٰہی + عشقِ رسول ﷺ اور اتباعِ مہدی علیہ السلام دیکھنے میں آیا ہے۔ ہر شہید نے اپنی محبت و عشق کا ثبوت دعوت الی اللہ سے دیا ہے اور اصل میں محبت کا معراج یہی ہے کہ محبوب کے نام پر بھی مُحب اپنی جان و مال قربان کرنے سے دریغ نہ کرے۔ یہی حال محترم ایوب اعظم صاحب کا تھا کہ وہ یہ پیغامِ مہدی علیہ السلام لے کر ہر خاص و عام سے ملتے اور ہر لمحہ اپنے کھانے پینے کے اوقات میں تبلیغ و دعوت کی چاشنی ضرور شامل کرتے اور دلائل حقہ کے ساتھ گفتگو کرتے اور ہمیشہ خوش ہوتے کہ میرے سننے والے کے

دل تک میری بات جا پہنچی ہے۔انہیں یہی شوق تھا کہ اسباق محبتِ الٰہی گلی گلی کوچہ کوچہ بانٹتا پھروں اور یہ کہ ۱۹۹۵ء کے بعد یہی میری حقیقی سروس ہے۔

حقوق العباد: بیوی کی گواہی سب سے زیادہ قابل قبول ہوتی ہے۔وہ اپنی گھریلو زندگی کا نقشہ بھی پیش کرتی ہے اور عام لوگوں کے ساتھ جو شوہر کے تعلقات ہوتے ہیں،ان کی ادائیگی کے کون سے احسن طریقے ہوتے ہیں،بیوی ہی صحیح طرح پیش کر سکتی ہے چنانچہ محترمہ بشریٰ ایوب صاحبہ لکھتی ہیں کہ تمام رمضان میں ایوب صاحب افطاری خود بنا کر غرباء اور ہمسایوں میں اور جہاں جہاں مزدور کام کر رہے ہوتے تھے،ان کو باقاعدگی سے دے کر آتے تھے۔شہادت کے دن نزدیکی گاؤں سے جوق در جوق آنے والے مرد،عورتیں اور بچے رو رو کر کہہ رہے تھے کہ یہ **آدمی فرشتہ تھا**،ہمیں پیسے،دوائیاں اور کتابیں لے کر دیتے تھے۔میں ان لوگوں کو نہیں جانتی تھی۔کتنے طالب علموں کو کتابیں خرید خرید کر بھیجا کرتے تھے جو بعد میں آ کر ملے تو معلوم ہوا کہ وہ نیک انسان کہاں کہاں اپنے خالق کی محبت کا اظہار کیا کرتا تھا۔جب واہ کینٹ کی مسجد بنائی تو رات دن وقار عمل میں حصہ لیا کرتے تھے۔آپ کے دوست مبشر صاحب اور محترم ظہور صاحب بھی ہمیشہ اتباعِ رسول پاکؐ میں سبقت لینے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔

ذمہ داری: الغرض احساسِ ذمہ داری ان کا طرۂ امتیاز تھا۔وہ ہمیشہ خود تکلیف برداشت کرتے اور بہت زیادہ لگن سے کام میں ہاتھ ڈالتے تھے۔یہ احساسِ ذمہ داری ہی تو تھا کہ زخمی حالت میں گھر کے اہل وعیال کو تسلیاں دیں اور ہسپتال لے جانے کے لئے خود کہا۔ایک بہادر انسان کی طرح دو گولیاں لگنے کے بعد بھی اوسان خطا نہیں کئے بلکہ خون روکنے کے لئے مستقل سینے پر ہاتھ جمائے رکھا۔ راستے میں اپنے بیٹے ثمر ایوب صاحب کو سارا قصہ سنایا اور صبر کی تاکید بھی کی کہ

ہاتھ پکڑ کر پیار کیا اور کہا کہ بیٹا! اپنا خیال رکھنا، امی اور بہنوں کا خیال رکھنا وغیرہ۔

دراصل یہ ایک ذمہ دار، فرض شناس اور پُر ہمت انسان کا عمل تھا کہ ایسے آخری وقت میں بھی گھر والوں کا فکر دل و دماغ پر سوار رہا۔ اور گو شناخت نہیں کر سکے تاہم واقعہ اور کچھ بنیادی سوچ گھر والوں کو دے گئے اور آخری دم تک اپنا فرض نبھایا۔ بیشک وہ شخص عسکرِ روحانی کا ایک سپاہی تھا جو اپنے خدا کے لئے زندہ تھا اور خدا کے لئے سر سوغات میں پیش کر گیا تاکہ آئندہ نسل زندہ رہنے کا سلیقہ سیکھ لے اور یہ سلیقہ صرف فنا فی اللہ اور فنا فی الرسول وجود کو ہی زیب دیتا ہے۔

سچی خوابیں: یہ ایک مستند حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی **ذکرِ اکبر** ہے اور اسی میں نجات مضمر ہے۔ لیکن اپنی محبت اور رحمت بانٹنے کے لئے رحمۃ اللعالمین محمد مصطفےٰ ﷺ کو اپنا وسیلہ بنایا ہے اور اس مبارک وسیلے کی برکت و پیروی سے خدا تعالیٰ نے انسانوں کو اپنا پیارا بنانے کا وعدہ کیا ہے۔ اور خدا تعالیٰ اپنے پیارے بندے کو اکثر سچی خوابیں بھی دکھاتا ہے اور اکثر حوصلہ اور صبر بھی عطا کرتا ہے۔ کیونکہ اس کا سچا بندہ توکل اور رضاء الٰہی کا بادشاہ ہوتا ہے۔ وہ خدا تعالیٰ سے پیار کرتا ہے اور سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے اور روحانی زندگی پا لیتا ہے۔ چنانچہ ایوب شہید محترم کو کچھ عرصہ سے شہادت کے متعلق کچھ خوابیں آ رہی تھیں۔ مثلاً بشریٰ لکھتی ہیں کہ:

ا۔ انہوں نے کہا "بشریٰ، مجھے آج کل اچھے خواب آ رہے ہیں۔ تم پریشان نہ ہو، اللہ تعالیٰ تمام تمہارے کام کر دے گا۔ سب کچھ اللہ پر چھوڑ دو۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ اور پھر ایک دن مجھے کہنے لگے کہ خواب یہ آئی ہے کہ میں بیٹھا ہوا ہوں کہ میرے پاس آموں کا ٹوکرا لایا گیا ہے اور مجھے آواز آئی کہ تم یہ لے لو۔ میں نے ٹوکرے میں سے جو سب سے بڑا آم ہے، وہ لے لیا۔ اور وہ عام آموں

کی نسبت بہت بڑا آم تھا۔آم جنتی پھلوں میں سے ہے جو انہوں نے لے لیا اور یہی پھل شہادت کا تھا۔''

۲۔ دوسری خواب میری بہن مسز مبشر کو آئی۔ ''جس دن ایوب صاحب شہید ہوئے، ڈھائی بجے رات وہ میرے گھر سے گئیں۔ وہ کہتی ہیں کہ میں ساری رات سوچتی رہی کہ ایوب صاحب ہسپتال کے راستے میں کیا کیا باتیں ثمر ایوب صاحب سے کرتے ہوں گے کہ مجھے نیند آ گئی کہ خواب میں ایوب صاحب آئے اور انہوں نے مجھے کہا کہ آپ بشریٰ سے کہیں کہ مت روئیں، میں بہت خوش ہوں، میں زندہ ہوں، مجھے بہت سی نعمتیں ملتی ہیں، وہ بالکل پریشان نہ ہوں۔'' اسی طرح شہادت کے دن ۷ جولائی ۱۹۹۸ء تقریباً ۳ یا ۴ بجے کا وقت تھا کہ بشریٰ صاحبہ نے خود خواب دیکھی، وہ کہتی ہیں کہ خواب میں دیکھا کہ ایوب صاحب فوت ہو گئے ہیں اور نیچے گرے ہوئے ہیں، جسم زخمی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ میں گھبرا کر اٹھی تو دعاؤں میں لگ گئی کہ خدایا رحم کر، میں نے کیا خواب دیکھی، تعبیر خود ہی سوچ لی ایوب صاحب کو جو فوت ہوتے دیکھا ہے، ان کی زندگی لمبی ہوگی اور ان کی Back bone کی تکلیف بھی شاید ٹھیک نہیں ہوگی۔ اسی شام عید میلاد النبی ؐ کا موقع تھا کہ شہادت کا واقعہ پیش آ گیا۔۔۔ بیشک وہ ہمیش کی زندگی پا گئے۔''

ناعاقبت اندیش لوگوں نے عید کے دن انہیں شہید کیا۔ وہ شخص جو خانہ کعبہ اور مسجد نبویؐ سے بارگاہِ الٰہی میں دعائیں کر کے لوٹا تھا، اور دو بار حج اکبر اور حج اصغر کا فیض یافتہ تھا، وہ شخص ثابت کر گیا کہ بیشک شہادت عید ہے۔ اور جو شخص عید کے دن شہید کر دیا جاوے، تو اس کی دو عیدیں جمع ہو جاتی ہیں،

اور

شہادت باغِ اسلام کے پھلوں میں سے ایک میٹھا ترین پھل ہے اور جو صرف نصیب والوں کو حاصل ہوتا ہے اور **محبت الٰہی** کے طالب کو ہی ملتا ہے۔

واقعۂ شہادت: کیا آپ احمدی ہیں؟ہاں کہنے والے شخص کو قتل کر دیا گیا۔ روزنامہ جنگ ،راولپنڈی،۹ جولائی ۱۹۹۸ء نے مندرجہ بالا تلخ حقیقت کو دو کالمی سرخی سے شائع کیا ہے۔

قارئین! یہ لمحۂ فکر ہے کہ ایک جیتا جاگتا ،خوش باش وجود ،بچوں کا باپ، بیوی کا شوہر،صرف اس لئے چھین لیا گیا کہ وہ آج کے جبّہ پوش ،شعلہ بیان ملّاں کا **ھمنوا** نہیں تھا۔ جبکہ قاتل یہ تک نہیں جانتا تھا کہ اس خوش نصیب انسان کا نام کیا ہے؟ جس کو میں جنت کی کنجی تھمانے لگا ہوں۔ بدنصیب انجان قاتل ایک تاریکی سے نکلا اور دوسری ابدی تاریکی میں چھپ گیا۔ اور خونِ وحشت کا یہی انجام ہوا کرتا ہے۔

قتل کرتے نہ تھے بے وجہ کسی انسان کو
خونِ وحشت میں حرارت کبھی ایسی تو نہ تھی

۷ جولائی ۱۹۹۸ء عید میلاد النبی کا دن تھا۔ لوگ جوق در جوق روشنیاں دیکھنے کے لئے گھروں سے باہر تھے کہ مکرم محمد ایوب اعظم صاحب اپنے گھر سے ساڑھے آٹھ بجے قریبی بازار گئے ، واپس گھر پہنچے نہ تھے کہ گھر کے قریب ہی انہوں نے دیکھا کہ دو اشخاص ایک تاریکی سے نکل کر سامنے آ گئے اور پوچھا ،آپ کا نام ایوب اعظم ہے۔ انہوں نے کہا، ہاں۔ حملہ آوروں نے پوچھا۔ کیا آپ احمدی ہیں۔ انہوں نے جواباً کہا، ہاں، الحمدللہ، میں احمدی ہوں۔ اس کے بعد قاتلوں میں ایک باریش انسان نے ان کی چھاتی پر دو فائر کئے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ جاتے جاتے دو ہوائی فائر بھی کئے۔ موصوف گر گئے اور بدقت گھر کی طرف بڑھنے لگے کہ ان کا بیٹا اور ہمسایہ نکل کر آ گئے۔ ان کو فوراً گاڑی میں ڈال کر ہسپتال لے جایا جا رہا تھا کہ راستے میں عید میلاد النبی کی وجہ سے راستے بند ہونے کی بناء پر ہسپتال لے جانے میں تاخیر ہوتی گئی اور وہ ہسپتال پہنچنے سے

پہلے ہی اپنے مولیٰ کے حضور حاضر ہو گئے۔

اگلے روز ۸ جولائی کو شام چھ بجے احمدیہ قبرستان کینٹ میں تدفین عمل میں آئی۔ مرکز سے ایک تین رکنی وفد محترم مرزا خورشید احمد صاحب، محترم ملک خالد مسعود صاحب اور محترم میجر شاہد احمد صاحب پر مشتمل تھا، جنازہ و تدفین میں شریک ہوا۔ [1]

تاثرات:

بشریٰ صاحبہ، اہلیہ ایوب اعظم شہید کے قلم سے شہادت کا واقعہ:

۷ جولائی عید میلا دالنبی تھی۔ ایوب اعظم صاحب مغرب کی نماز پڑھ کر گھر سے نکلے۔ اپنے کمرے کی لائٹ جلتی چھوڑ گئے حالانکہ ہمیشہ عادت کے مطابق بند کر کے جاتے تھے۔ میرے پوچھنے پر بیٹی نے بتایا کہ ابو باہر گئے ہیں، شام کو وہ ٹہلتے تھے۔ اس کے علاوہ دوستوں کے ساتھ گپ شپ بھی کرتے تھے۔ باتوں باتوں میں شام کے ۹ بج گئے۔ اور وہ اسی وقت واپس گھر آنے کے لئے مڑے۔ دوکان کے نزدیک ہی کھڑے رہے۔ دوکان ہمارے گھر سے پچاس گز کے فاصلے پر ہی ہوگی بلکہ اس سے بھی کم۔ دوستوں کو کہا کہ TV پر خبریں شروع ہو گئی ہوں گی، میں واپس جا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آدھا فاصلہ طے کیا ہوگا جو گھر کے کوارٹر کے بالکل نزدیک ہی تھے کہ اسی دوران دوسری گلی سے چھپے ہوئے دو آدمی ایوب صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ اور ایوب صاحب سے کہا کہ آپ کا نام ایوب اعظم ہے۔ ایوب صاحب نے کہا کہ میرا نام ایوب اعظم ہی ہے۔ پھر دوبارہ انہوں نے کہا کہ آپ ایوب اعظم ہی ہیں۔ انہوں نے کنفرم کرنے کے بعد کہا کہ یہ سامنے والا گھر آپ کا ہے۔ ایوب صاحب نے کہا کہ ہاں، یہ سامنے والا میرا گھر ہے۔ پھر ایوب صاحب سے کہا کہ آپ احمدی ہیں۔

---

[1] روزنامہ الفضل

ایوب صاحب نے کہا کہ خدا کے فضل و کرم سے میں احمدی ہوں۔اس کے بعد
نذیر احمدی کا گھر پوچھا۔ایوب صاحب نے کہا کہ میں نہیں جانتا۔یہ سننے کے بعد
انہوں نے ایوب صاحب کے سینے پر فائر کیے۔اس پر ہم فوراً باہر بھاگے۔اور ہم
نے ایوب صاحب کو زخمی حالت میں گرے ہوئے دیکھا۔سینے میں سے خون نکل
رہا تھا۔ایوب صاحب نے خون روکنے کے لئے سینے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔میں،
میرا بیٹا اور بیٹیاں ایوب صاحب کو اٹھا کر گیٹ تک لائے۔میرے بیٹے نے کہا کہ
ابو کو اندر لے جاتے ہیں لیکن میں نے کہا کہ نہیں، ان کو فوراً ہسپتال لے جاتے
ہیں۔میری بیٹیاں رو رہی تھیں اور ایک بیٹی بھاگ کر انور صاحب کو بلانے چلی
گئی۔لوگوں نے جب ہماری چیخیں سنیں تو بھاگ کر آئے اور ایوب صاحب سے
پوچھا کہ کون لوگ تھے۔ایوب صاحب نے کہا کہ میں نہیں جانتا، میں نہیں پہچانتا۔
ایوب صاحب کو ہم نے جلدی سے پانی پلایا۔اور وہ بھی کہہ رہے تھے کہ مجھے
ہسپتال لے چلو۔اسی اثنا میں انور صاحب جلدی سے آگئے اور میرا بیٹا اور وہ
گاڑی میں ڈال کر ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔ایوب صاحب بالکل گھبرائے
ہوئے نہیں تھے اور ہم بھی یہی سمجھ رہے تھے کہ زخمی ہو گئے، گولی نکل جائے گی تو
واپس آجائیں گے۔چونکہ ایوب صاحب پر دو گولیاں لگی تھیں، ایک جسم کے آر پار
ہو گئی اور ایک سینے سے نکل کر پیٹ کی طرف چلی گئی، نکلی نہیں۔ہم نے ایوب
صاحب کو گاڑی میں ڈالا، وہ بدستور کلمہ پڑھتے رہے۔بیٹا باپ سے باتیں کرتا رہا
تاکہ وہ اپنی طرف توجہ نہ دیں۔خون بہہ رہا تھا۔ہمارے گھر سے ہسپتال ۵ میل
کے فاصلے پر ہوگا۔راستے میں ایوب صاحب کو بتایا کہ بیٹے، میں گھر واپس آرہا تھا
کہ اس طرح اندھیرے میں سے دو آدمی نکل کر میرے پاس آئے تھے اور اس
طرح انہوں نے میرے ساتھ باتیں کیں، جب میں ان سے بات کر چکا تو
انہوں نے مجھ پر فائرنگ شروع کر دی اور بھاگ گئے۔ایوب صاحب پھر کلمہ

پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ جب آدھے راستہ پر پہنچے تو انہوں نے بیٹے کو پیار کیا اور ہاتھ پکڑ کر کہا کہ بیٹے، اپنا خیال رکھنا، امی اور بہنوں کا خیال رکھنا۔ اور بیٹے کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ اس کے بعد خون والی الٹی آئی۔ اس کے بعد کیا ہوا، لکھتے ہوئے قلم میں ہمت نہیں۔

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

اس کے بعد بیٹے نے بہت آوازیں دیں ابو، ابو، بولیئے، مجھ سے باتیں کرو مگر وہ تو اپنے پیارے خدا کے پاس چلے گئے تھے کیونکہ اس دن عید میلاد النبیؐ تھا، لوگ لائیٹیں دیکھنے جا رہے تھے، سڑک پر بہت رش تھا لیکن پھر بھی جتنی جلدی کر سکتے تھے، گاڑی تیز لے کر گئے مگر جب P.O.F. ہسپتال پہنچے تو ڈاکٹر نے دیکھ کر کہا کہ ڈیتھ ہو چکی ہے۔ میرے بیٹے نے ڈاکٹر سے کہا کہ آپ کوشش تو کریں، شاید بے ہوش ہوں، اس کی تسلی کے لئے اس نے چیک بھی کیا، مگر بے سود۔ اس کے بعد وہ بہت رویا، تڑپا، مگر کیا ہو سکتا تھا۔

بیٹے نے ہسپتال کے سرد خانے میں باپ کو رکھوا کر جب واپس آیا تو اس نے آکر جو ایوب صاحب کے ساتھ واقعہ ہوا تھا، ہمیں بتایا۔

جب ایوب صاحب کو ہسپتال لے کر گئے ہیں، اسوقت میرا گھر عورتوں سے بھر چکا تھا۔ ہم دعائیں کر رہے تھے کہ خیر کی خبر آئے۔ سب لوگوں کو پتہ تھا کہ ایوب صاحب کی ڈیتھ ہو چکی ہے لیکن مجھے اور میری بیٹیوں کو پتہ نہیں تھا۔ ہم ان کو کہیں کہ دعا کریں، ایوب صاحب ٹھیک ہو کر آجائیں مگر وہ بچیوں سے یہ کہیں کہ بیٹیو، صبر کرو، ایوب صاحب اب نہیں آئیں گے۔ ان کے لئے دعا کرو۔ بچیاں تو کسی صورت میں مان نہیں رہی تھیں کہ نہیں، ہمارے ابو بہت بہادر ہیں۔ وہ باتیں کر رہے تھے، خود گاڑی میں بیٹھے تھے، یہ کیسے ہو سکتا ہے، مگر پھر وہ حقیقت کو مان گئیں۔ پھر ہم نے رشتہ داروں کو اطلاعیں کر دیں۔ سب آ گئے + ایوب صاحب

شہید ہو گئے۔ مرکز کو بھی اطلاع کر دی گئی۔ حضور کو بھی اسی وقت اطلاع مل گئی۔ پوری دنیا میں فوری طور پر پتہ چل گیا۔

اور پھر آخری سفر کے لئے تیاری شروع ہو گئی۔ پوسٹ مارٹم ہوا۔ تابوت بنا+ ایوب صاحب کو ۴ بجے گھر واپس لے کر آئے۔ ۶ بجے جنازہ تھا+ پورا گھر لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ باہر مرد ٹینٹ لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ غیراز جماعت کی بہت بڑی تعداد آئی ہوئی تھی۔ مرکز سے، پنڈی سے، حویلیاں، ٹیکسلا، نزدیکی جگہ سے سب آئے۔ ایوب صاحب کا چہرہ چمک رہا تھا، مسکرا رہے تھے۔ میں نے اور بچوں نے جب ان کو دیکھا تو ہمیں سکون مل گیا کہ ایوب صاحب تو خود گواہی دے رہے ہیں کہ میں بہت خوش ہوں۔ چہرہ روحانیت سے بھرپور تھا۔ غیراز جماعت اور محلے دار عورتیں اور مرد تھے، وہ کہہ رہے تھے کہ یہ وہ ایوب صاحب لگ ہی نہیں رہے، کتنا نور ہے، چہرہ چمک رہا ہے۔ غیراز جماعت کے لوگ کہہ رہے تھے کہ جنتی تو ایوب صاحب لگ رہے ہیں، دوزخی وہ لوگ ہیں جنہوں نے یہ کام کیا ہے۔ ایوب صاحب تو شہید ہوئے ہیں۔ غیراز جماعت نے دلی صدمہ اور افسوس کا اظہار کیا۔ ربوہ سے مرزا خورشید احمد، ناظر اعلیٰ کی قیادت میں بہت سے مہمان پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے تمام واقعہ کا خود جائزہ لیا اور ایوب صاحب کے تمام واقعہ اور گھر اور نماز جنازہ کی ویڈیو فلم بنوائی۔ جو جہاں جہاں احمدیہ جماعت وہاں لندن سے دکھائی گئی۔ جمعہ کے دن خطبہ کے بعد۔

واہ میں اتنا بڑا جنازہ نہیں ہوا، جتنا ایوب صاحب کا ہوا۔ غیراز جماعت نے بھی نماز جنازہ پڑھی اور دعا کی۔

شجاعت و اطاعت: شہید ایوب صاحب کی قربانی کا واقعہ پڑھنے کے بعد بے ساختہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی ایک دعا نکلتی ہے جو دل پر اثر کر جاتی ہے۔ ''اے خدا تو ہمارے سخت زخمی دلوں کے لئے

اندمال اور سکینیت کا سامان پیدا فرما۔۔۔اے خدا ایسا ہی کر، دیکھ ہم تیرے حضور ذبح ہونے والی قربانیوں کی طرح تڑپ دیکھ رہے ہیں۔"

اور

پھر ہمارے آقا سیدنا امیر المومنین نے ہمیں للکار کر تیار کیا اور ایک ایسا پیغام فرمایا جو ہمیں سینہ بہ سینہ رواں دواں رکھتا ہے۔فرماتے ہیں:

"اے احمدی، اٹھ اپنوں سے بھی اسلام کی خاطر لڑ اور محمد مصطفیٰؐ کی خاطر ہر تیر جو تیری طرف چلایا جاتا ہے، اسے خوشی سے قبول کر کہ اس سے بہتر کوئی موت نہیں، جو میرے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ میں آئے۔"

محترم محمد ایوب اعظم نے اپنے آقا امیر المومنین خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ کو لبیک یا سیدی کہتے ہوئے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا، ہاں الحمدللہ، کہ میں احمدی ہوں۔اور اسلام کی خاطر اور محمد مصطفیٰؐ کی خاطر سینے پر گولیاں کھائیں۔اور وہ موت قبول کر لی جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں آئی۔بیشک اے احمدی تو زندہ ہے۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو خلیفۃ المسیح الرابع، امامِ وقت نے مرکزِ تثلیث کے میدان میں کھڑے ہو کر گواہی دی کہ سر سوغات میں پیش کرنے والے "محمد ایوب اعظم ایک مخلص احمدی تھے" اور آپ کے فرمان کے مطابق احمدیت یعنی حقیقی اسلام کی خاطر جان کی بازی لگانے والے تھے۔وہ شجاع اور دلیر تھے کہ کئی بار اسلام کی خاطر آزمائے گئے تھے۔۱۹۹۱ء میں بھی انہیں بے روزگار صرف اس لئے کر دیا گیا تھا کہ۔۔۔اور پھر نہ معلوم وجوہات کی بناء پر ریٹائر کر دیئے گئے۔نہ معلوم سے مراد یہ ہے کہ پتہ ہے جماعت کی دشمنی میں کیا گیا ہے مگر حکومتی ریکارڈ کے مطابق وجوہات نہ معلوم ہیں۔

اور پھر ایک دن ۷ جولائی ۱۹۹۸ء کو وجوہات نہ معلوم کی بناء پر محترم

محمد ایوب اعظم کو شہادت کا جام پلا دیا گیا۔ پس اے جانباز ایوب آپ زندہ ہیں۔ خدا تعالیٰ کا رزق آپ کو پہنچ رہا ہے، فرشتے آپ کے ساتھ **مصافحہ** کے لئے حاضر ہیں۔

لاکھ مدعی ستم ڈھائے پر اے غیرتِ عشق
جنسِ اِخلاص کو ارزاں نہیں ہونے دیں گے

انشاءاللہ

اک نظر میں

نام	:	محترم محمد ایوب اعظم صاحب
والد صاحب کا نام	:	محترم شیخ نیاز الدین صاحب
تاریخ پیدائش	:	۱۹۳۷ء، پیدائشی احمدی
عمر بوقت شہادت	:	۶۲ سال
تعلیم	:	بی ایس سی
پیشہ	:	ورکس مینیجر، واہ فیکٹری
آبائی مقام	:	دھرم سالہ
مقامِ شہادت	:	واہ کینٹ
تاریخ شہادت	:	۷ جولائی ۱۹۹۸ء
آلۂ قتل	:	پستول
جنازہ	:	شمولیت محترم مرزا خورشید احمد، محترم ملک خالد مسعود صاحب، محترم میجر شاہد احمد سعدی۔
تدفین	:	واہ کینٹ، احمدیہ قبرستان
شمائل	:	داعی الی اللہ، مجلسی مزاج، حلیم طبع، تہجد گزار، اہل وعیال سے دلی وابستگی جماعت سے جانثاری، رابطہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم　　　　نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

ھوالناصر، خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

محترم ماسٹر نذیر احمد بگھیو

دیکھا جو تیر کھا کے کمین گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

سرزمینِ سندھ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کی مٹی نے بے شمار علماء کرام، شعراء کرام، اولیاء اللہ، دانشور، عاشقانِ رسولؐ اور شہداء کرام پیدا کیے ہیں، جنہوں نے اپنی قابلیت، بصارت و بصیرت، قائدانہ صلاحیتوں اور قربانی و جانثاری کے ساتھ عوام کو جینا سکھلایا ہے۔ مگر اس وقت میرا موضوع ہے کہ سندھ میں عموماً نواب شاہ اور لاڑکانہ میں خصوصاً ایسے ایسے شہداء کرام قربان ہوئے ہیں کہ جو قوم کو ایسے مزین کر گئے ہیں کہ میری قوم کے **نگینے لوگ** بن گئے اور ہمیشہ کے لئے خود روشن ہو گئے اور ہمیں روشن کر گئے۔ الحمد للہ.

ایسے عظیم مجاہدوں و جانثاروں اور شہداء کی صف میں آج ہم ۱۱۰ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو محترم ماسٹر نذیر احمد بگھیو کو بھی کھڑا دیکھتے ہیں۔ یہ وہی عظیم شخص ہیں جو اپنا خون دے کر لوگوں کی رگوں میں علم و ادب کا دریا بہاتے تھے، حیوان کو انسان بناتے تھے، جو ماؤں کی گود کو سورج کی روشنی سے منور کرتے تھے، جو قوم کے مسیحا بناتے تھے اور لفظوں سے مرہم لگاتے تھے اور نصائح سے کردار کو تعمیر کرتے تھے۔

بیشک انہوں نے پھولوں کو ثمر اور درختوں کو تناور عظیم درختوں میں تبدیل کیا اور انہیں دنیا میں جینے کا ڈھنگ سکھلایا۔ وہ حروف شناس تھے اور حروف بانٹتے تھے۔ کچھ دینے اور بانٹنے کا علم وعمل ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۸ء تک جاری وساری رہا اور تادمِ آخر وہ مضبوط نقوش چھوڑ گئے جو واضح اور روشن ہیں اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کی یاد تازہ کرتے ہیں اور بعد میں آنے والوں کے لئے راستے ہموار کر گئے ہیں۔

یہ عظیم استاد المکرّم جن کا ذاتی نام نذیر احمد تھا، پیدائشی احمدی تھے۔ ان کے والد صاحب کا نام شفیع محمد تھا جو گوٹھ ماہی جاپھاں تعلقہ کنڈیارو ضلع نوشہرہ فیروز میں رہائش پذیر تھے۔ محترم نذیر احمد صاحب چار سال کے تھے جب ان کے والد بزرگوار وفات پا گئے۔ والد صاحب کے تین بھائی احمدی ہوئے تھے۔ (۱) حکیم محمد موہیل صاحب (جو بعد میں جماعت کنڈیارو کے صدر جماعت بھی رہے)، دوسرے شفیع محمد صاحب اور تیسرے سب سے چھوٹے بھائی غلام رسول صاحب تھے۔ یہ تینوں بھائی اسی علاقہ میں رہتے تھے۔ ان کے نانا جان حضرت اخوند محمد رمضان صاحبؓ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بیعت ۱۸۹۸ء میں قادیان جا کر دستی طور پر کی تھی۔ یہ مبارک وجود حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے صحابی اور سندھی احمدیوں میں پہلے شخص تھے جو وقت کے امام مہدی علیہ السلام کی شناخت کر کے احمدیت یعنی حقیقی اسلام میں شامل ہوئے تھے۔ جناب محمد رمضان صحابی حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایک خواب کی بناء پر احمدیت قبول کی تھی۔

قارئین! اگرچہ بعض واقعات اہم اور صداقتِ مسیح موعود علیہ السلام کی وضاحت کے لئے پیش کرنے ضروری ہوتے ہیں لیکن سلسلہ ٹوٹ جانے کے خوف سے صرف دو ایک باتیں جو عظمت کی حامل ہیں، صداقتِ مہدی علیہ السلام کے عنوان میں درج کروں گی، انشاءاللہ امید ہے، ایمان افروز ہوں گی۔

ا۔ اخوند محترم محمد رمضان صاحب کے تینوں نواسے بھی احمدیت میں ایک مثالی مقام رکھتے تھے۔ حکیم محمد موہیل بہادر اور مخلص انسان تھے۔ وہ ایک وقت میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے باڈی گارڈ کے طور پر فرائض سرانجام دیتے رہے۔ وہ بہت نڈر اور جماعت احمدیہ کے فدائی تھے، وصیت کی ہوئی تھی اور بہشتی مقبرہ ربوہ میں مدفون ہیں۔

۲۔ محترم شفیع محمد صاحب کو خدا تعالیٰ نے ۵ جنوری ۱۹۳۷ء کو ایک بیٹا عطا کیا جس کا نام انہوں نے نذیر احمد تجویز کیا مگر افسوس کہ محترم شفیع محمد اپنے بیٹے کو بچپن میں تنہا چھوڑ کر خدا تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔

محترم نذیر احمد نے اپنے گاؤں میں طالب علمی کا زمانہ گزارا اور سندھی فائنل تک تعلیم حاصل کی۔ اور مختلف اوقات میں مختلف درسگاہوں میں سندھ کے عوام کو حروف شناسی میں مہارت دیتے رہے۔ اور اس طرح ۲۸ سال ۱ ماہ انہوں نے استاد المکرّم کے فرائض سرانجام دیے۔ یہ تمام عرصہ انتہائی ذمہ داری کا ضامن ہے کیونکہ آپ کے شاگردوں میں بہت سے ممتاز عہدوں پر فائز ہیں۔ الحمد للہ.

چونکہ پرورش و تربیت کا ابتدائی زمانہ محترم نذیر احمد صاحب نے اپنے بزرگ چچا حکیم محمد موہیل صاحب کے زیرِ سایہ گزارا تھا، اس لئے بہت سی اعلیٰ صفات آپ میں منتقل ہو گئی تھیں۔ آپ کے دادا محمد لقمان صاحب نے جو کہ اپنی عمر کے آخری زمانے میں احمدی ہو گئے تھے، بہت محبت و توجہ سے محترم نذیر احمد صاحب کو مربیانہ ساتھ دیا۔ اس طرح نذیر احمد صاحب ایک مثالی اور ایمان افروز شخصیت بن کر سامنے آگئے اور سندھ کی قسمت چمک گئی۔ چنانچہ

مثالی خاندان: محترم حکیم موہیل صاحب نے اپنی دختر بشریٰ بیگم سے نذیر احمد صاحب کی شادی کر کے انہیں اور بھی اپنے قریب کر لیا۔ چنانچہ یہ خاندان

سندھ میں اپنے آباؤ اجداد کے لحاظ سے پہلا خاندان تھا جو گوٹھ ماہی جالبان تعلقہ کنڈیارو کے مکیں تھے اور جن کے سرپرست اخوند محمد رمضان صاحب نے ۱۸۹۸ء میں خود جا کر قادیان میں حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لئے مجھے درپیش ہوتی ہے کہ عموماً سندھ میں سے کم لوگ تبدیلیٔ عقائد کی طرف راغب ہوتے ہیں، وہ مذہبی لحاظ سے زیادہ مخالفت کرتے ہیں اور نہ عقائد کے پرکھنے میں متوجہ ہوتے ہیں اور اگر اس صورت حال میں کوئی خاندان انقلابی قدم اٹھائے تو یقیناً وہ مثالی خاندان ہوگا اور وہ عظیم شخص بھی نڈر اور بے خوف و خطر شخصیت کا مالک ہوگا۔ عشقِ الٰہی اور اتباعِ رسول کریم ﷺ دونوں آپس میں لازم وملزوم ہیں۔ خدا سے محبت کرنے والا خدا کی تلاش میں ضرور نکلتا ہے اور وہ جان لیتا ہے کہ مجھے خدا تعالیٰ کو پانے کے لئے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی پیروی اور فرمانبرداری صحیح معنوں میں کرنی پڑے گی کیونکہ خدا کی ملاقات کے لئے سرورِ کائنات محمد مصطفیٰ ﷺ کی دہلیز پر سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ سو نذیر احمد صاحب کو کچھ روحانی طاقتیں تو خدا تعالیٰ کی طرف سے ودیعت تھیں، کچھ انہوں نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز سے سیکھیں اور پھر خدا کے فضل سے انہیں بزرگوں کے ماحول و تربیت نے بھی مہیا کر دیں اور وہ ایک دن صقیل شدہ ہیرا بن گئے لہٰذا اطاعتِ امام، نظم و تنظیم، حصولِ علم اور ایثار و قربانی کا جذبہ لے کر محترم نذیر احمد صاحب شہید ایک ایسی شخصیت میں ڈھل گئے جو تقویٰ شعار تھی اور ایمان کے اعلیٰ مدارج پر قائم تھی۔ حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ فرماتے ہیں کہ ''ایمان مثل ایک انجن کے ہے، جب ایمان ہوتا ہے تو سب حقوق خود بخود نظر آتے ہیں اور بڑے بڑے اعمال اور ہمدردی خود ہی انسان کرنے لگتا ہے لیکن یہ ہر کسی کے نصیب میں نہیں۔''[1] اور جن کے نصیب میں

[1] ملفوظات، حصہ ہشتم صفحہ ۱۰۷

ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے لئے انعام کے درجات مقرر فرما کر انعام عطا کرتا ہے۔اس لیے فرماتا ہے:

مَن یُطیعِ اللّٰہ والرسول فاولک مع الذین العم اللّٰہ علیھم من النبیین والصدیقین و شھداء والصلحین و حَسَنَ اَولیک رفیقا.

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اطاعتِ خداوندِ عالم اور اطاعتِ رسول پاک ﷺ کو موجب انعام قرار دیا ہے۔جن چار انعامات کا ذکر فرما کر خدا تعالیٰ انسانوں کو سر بلندئ اخلاق اور حسنِ عبادت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔اس میں سرفہرست توحید ہی ہوتی ہے،توحید ہی وہ منبع ہے جس کی تمام شاخیں حقوق اللہ اور حقوق العباد، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور حسن اخلاق اور قربانی انسان کے سامنے آتے ہیں۔اگر توحید پر پختہ ایمان نصیب ہوجائے تو سب راستے **قرب الٰہی** مہیا کرتے ہیں۔

محترم نذیر احمد صاحب شہید خدا تعالیٰ کے فضل سے حقوق اللہ کی ادائیگی میں بہت مستعد ہوا کرتے تھے۔محترم غلام حیدر ناصر صاحب کہتے ہیں کہ ''حکیم محمد موہیل صاحب چچا سسر کی کافی زمینیں تھیں۔وہ والد صاحب کو سبزی والی زمین کے لئے پانی دیتے تھے۔اکثر یہی ہوتا کہ والد صاحب نے پانی سبزی میں چھوڑا، اذان ہوئی، پانی کو چھوڑ، نماز پڑھنے چلے آئے۔نماز پڑھنے کے بعد جلدی جلدی واپس جا کر دیکھتے کہ ساری سبزی کی فصل ڈوبی ہوئی ہے اور اس طرح کافی نقصان ہوجاتا لیکن آپ نے نماز کبھی نہیں چھوڑی۔نواب شاہ میں مسجد گھر سے ڈیڑھ کلومیٹر دور ہے۔والد صاحب دو دفعہ مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تھے۔ایک دفعہ ظہر کی نماز پڑھ کر گھر آتے اور پھر مغرب کے ٹائم چلے جاتے اور عشاء کی نماز پڑھ کر واپس لوٹتے تھے۔لوگ گرمی کی شکایت کرتے مگر آپ ہمیشہ

کہتے کہ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی حالانکہ نواب شاہ کی گرمی انتہا پر ہوتی ہے۔
سالہا سال باقاعدگی سے پیدل نماز پڑھنے جاتے تھے۔حضور کا خطاب M.T.A
پر بھی باقاعدگی سے دیکھتے اور جب تک حضور کا خطاب ختم نہ ہوتا، T.V پر نظریں
جمائے بیٹھے رہتے اور کہتے تھے کہ خلیفہ وقت کو دیکھنا بھی ثواب ہے۔آپ عاملہ
کے رکن اور زعیم اصلاح وارشاد بھی تھے۔جب مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تو پتہ
چلتا کہ خدام کا یا اطفال کا اجلاس ہے تو وہ بھی بیٹھ کر سنتے اور جب قائد صاحب
کہتے کہ ماسٹر صاحب، یہ اجلاس خدام یا اطفال کا ہے، آپ کا ہونا ضروری نہیں تو
کہتے، آپ اجلاس جاری رکھیں، میں بھی بیٹھا ہوا ہوں اور ساری کاروائی اطفال
کی سن کر اٹھتے تھے۔رمضان شریف کے مہینوں میں عموماً مساجد میں ہی وقت
زیادہ گزارتے تھے۔"

امتیازی اوصاف: ماسٹر نذیر احمد صاحب شہید میں خدا تعالیٰ نے بہت سے
مثالی خلق جمع کئے ہوئے تھے۔وہ عموماً ایک مربیانہ سہارا ثابت ہوا کرتے تھے۔
اپنے اسکول کے زمانہ میں بھی انہیں اصلاحی اقدار کا خیال رہتا اور ہمیشہ احادیث
کی روشنی میں بچوں کو گائیڈ کرتے۔کبھی انہیں حدیث سناتے اور کبھی انہیں کہانی
کے رنگ میں سبق آموز روایات بیان کرتے۔ان کا مقصد اصلاح ہی ہوا کرتا
تھا۔ان کی زیادہ تر یہی کوشش ہوتی کہ ہر اصلاحی قدم میرے ملنے والے میں منتقل
ہو جائے اور سب سے اچھی بات کا نمونہ ضرور پیش کرتے تھے۔والد صاحب
بیماروں کی **تیمار داری** میں آگے آگے ہوتے۔جب پتہ چلتا کہ فلاں بندہ بیمار
ہے چاہے احمدی ہو یا غیر احمدی، روزانہ باقاعدگی سے تیمارداری کرنے جاتے۔
والد صاحب کے بھانجے ممتاز علی جن کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا، ٹانگ میں فریکچر ہو گیا
تھا، ہاسپٹل میں ایک مہینہ کے قریب داخل رہے، چوتھی منزل پر ان کا وارڈ تھا۔
روزانہ جاتے، وہ منع کرتے کہ ماموں اتنی سیڑھیاں چڑھ کے آتے ہیں، آپ کو

تکلیف ہوگی، بس فون پہ ہی پوچھ لیا کریں۔فون پہ بھی پوچھتے اور وہاں جا کے بھی خیریت پوچھتے۔عبدالحکیم جو ہمارے خالہ زاد بھائی ہیں اور والد صاحب کے بھی رشتہ کے بھانجے لگتے ہیں، کہنے لگے کہ بیمار کی تیمارداری میں ماموں سے کوئی نمبر نہیں لے جا سکتا تھا۔ہم جوان بھی ان کے مقابل میں سست پڑ جاتے تھے لیکن جب کوئی بیمار ہوتا، ان کے لئے دعائیں بھی کرتے اور خیریت بھی دریافت کرتے۔والد صاحب **مہمان نوازی** میں بھی آگے آگے تھے۔کوئی بھی گھر آ جائے، کوشش کرتے کھانا کھا کر جائے یا چائے اور کولڈ ڈرنک کم از کم پی جائے۔ بھائی طارق محمود کہتے کہ چچا کے پاس ہم جب بھی جاتے، کچھ کھائے پیئے بغیر نہیں چھوڑتے، گرمیوں کا موسم ہوتا تو بغیر کولڈ ڈرنک پلانے کے نہیں چھوڑتے تھے۔ ایک گھنٹہ بعد آ جاؤ تو پھر پلاتے، زبردستی کرتے۔اس لئے ہم جماعت والے بہت ضروری کام سے آتے تھے۔ہمارے کچھ رشتہ دار غریب ہیں، وہ ریڑھی چلاتے ہیں، فروٹ بیچتے ہیں اور سوکھی روٹی خریدتے ہیں۔پانچ کی تعداد میں ہیں، ان میں سے ایک عبدالحکیم کہتا ہے کہ ماموں جب بھی راستے سے گزرتے ہوئے ہمیں دیکھتے، ہاتھ پکڑ لیتے اور کہتے کہ چلو کھانا کھالو، ہم انکار کرتے تو کہتے کہ چلو چائے پی لو۔اگر پھر انکار کرتے تو پانی تو ضرور پلاتے۔بس اصرار یہ کرتے کہ کچھ نہ کچھ کھا کر ضرور جایئے۔اور کھانے کے یا پینے کے بعد ازراہ ہمدردی بہت مبارک طریقہ سے کچھ نصیحت ضرور کر دیتے تھے۔ٹیچروں کو کھانا بھی خود کھلاتے تھے۔اسکول کا فرنیچر بھی خود بنواتے۔ان کی کوشش ہوتی کہ غریبوں کے بچے پڑھیں۔اس لئے غریب لڑکوں کو کپڑے اور کتابیں لے کر دیتے تھے۔ اسی محبت اور لگن کی وجہ سے شاگرد دعائیں دیتے ہیں۔

والد صاحب سلام کرنے میں پہل کرتے تھے اور کسی سے ملتے تو گلے سے لگا کر بھینچتے، خیریت پوچھتے۔کوئی چھوٹا بچہ بھی چلتے ہوئے راستہ میں ملتا تو ان

سے بھی محبت سے سے اخلاق سے ملتے، والدین کی خیریت پوچھتے، بچوں کو پورا نام لے کر پکارتے، کبھی کسی کا آدھا نام نہیں پکارا۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی حدیثیں، صحابہؓ کے قصے سناتے رہتے اور کوشش کرتے تقلید کرنے کی۔

والد صاحب استاد تھے، اس لئے ان کی کوشش ہوتی کہ اپنی اولاد بھی پڑھ لکھ جائے اور دوسرے بچے بھی پڑھائی میں اچھے ہوں۔ والد صاحب کے کئی شاگرد بہت اچھی پوسٹوں پہ ہیں۔ والد صاحب کے ایک شاگرد جو اس وقت بڑی اچھی پوسٹ پہ ہیں، آفیسر ہیں، وہ تعزیت کے لئے آئے۔ SHO پولیس بھی بیٹھے ہوئے تھے اور کہنے لگا کہ اگر استاد نذیر احمد میری حوصلہ افزائی نہیں کرتے، کتابیں لے کے نہیں دیتے، میں آج کسان ہی ہوتا، ہل چلا رہا ہوتا۔ ان کی وجہ سے میں آج اس عہدہ پہ ہوں۔ اسی طرح کے کئی اور لوگ تھے جو شاگرد تھے، والد صاحب کے اور تعریفیں کرتے جارہے تھے۔

والد صاحب کی تعزیت کے لئے جتنے لوگ آئے۔ احمدیوں سے زیادہ غیر احمدی آئے اور دعا کرنے کے بعد ان کے منہ سے بے اختیار نکل جاتا کہ شہید ہوگئے۔ وہ کیوں نہ کہیں بقول بھائی طارق محمود کے کہ چچا جب چلتے تھے تو پاؤں بھی سنبھال کے زمین پر رکھتے تھے کہ کہیں چیونٹی یا کوئی جاندار تو نہیں آ گیا پاؤں میں۔

خیر کم خیر کم لاھلہ: اسی طرح والد صاحب کو مجھ اور سب بہن بھائیوں سے بے انتہا محبت تھی۔ میں نے والد صاحب کے پاس پرائمری تعلیم بھی حاصل کی۔ والد صاحب ہمیں پڑھاتے رہتے۔ کوئی مہمان دوست وغیرہ آ جاتا تو ان سے کہتے کہ بچوں سے سوالات پوچھو۔ وہ سوال جواب پوچھتے، میں اکثر فرسٹ آتا۔ والد صاحب کے دوست کہتے کہ یہ تمہارا بیٹا ماشاء اللہ کافی ہشیار ہے، اس کا خیال رکھو۔ سیکنڈری میں جائے تو کسی اچھے اسکول

میں داخل کراؤ۔ دیکھنا کہ یہ بڑا افسر بنے گا۔ یہ سن کے خوش ہوتے، دوسروں کو بتاتے، گھر میں آ کے بتاتے کہ فلاں دوست یہ کہہ رہا تھا۔

ہمارے نانا جان حکیم محمد موہیل صاحب کو تعلیم سے بے حد لگاؤ تھا۔ وہ B.D ممبر بھی تھے۔ انہوں نے پہلے گاؤں میں پرائمری اسکول کی بلڈنگ بنائی اور وہاں والد صاحب کو ٹرانسفر کر کے لگایا۔ اپنے ذاتی خرچہ پر اسکول کی بلڈنگ بنوائی اور فرنیچر تک خود بنوایا۔ اور اس کے بعد مڈل اسکول کی بلڈنگ بھی ذاتی خرچہ پر بنوائی اور اس کے لئے فرنیچر بھی خود بنوایا۔ ٹیچروں کو کھانا بھی خود کھلاتے تھے۔ بس ان کی اور والد صاحب کی کوشش ہوتی تھی کہ غریبوں کے بچے بھی پڑھیں اور غریب لڑکوں کو کپڑے اور کتابیں بھی لے کے دیتے تھے۔ اسی محنت اور لگن کی وجہ سے کئی شاگرد آجکل بڑے اچھے عہدوں پہ ہیں اور نانا جان اور والد صاحب کو دعائیں دیتے ہیں۔

نواب شاہ شفٹ ہونے کا واقعہ بھی اولاد سے محبت کی ایک لازوال مثال اور تعلیم سے رغبت کا نتیجہ تھا۔ میں نے میٹرک کا امتحان کنڈیارو شہر سے پاس کیا۔ اس وقت گاؤں کے نزدیک جو شہر تھا، وہ کنڈیارو جو تحصیل ہیڈ کوارٹر تھا، اسی میں کوئی کالج نہیں تھا۔ والد صاحب چاہتے تھے کہ میری اولاد بہت زیادہ پڑھ لکھ کے بڑا آدمی بنے۔ مجھے نواب شاہ کالج میں داخلہ دلانے کے لئے لے آئے۔ وہاں ہمارے کچھ رشتہ دار بھی رہتے تھے۔ نواب شاہ ہمارے گاؤں سے ۱۵۰ کلومیٹر دور ہے۔ والد صاحب کے ایک احمدی دوست علی اکبر صاھب نواب شاہ میں پٹواری تھے۔ خواہش تھی کہ علی اکبر صاحب کے پاس رہوں اور کالج میں پڑھوں۔ جب ان کے مکان پہ آئے تو پتہ چلا کہ ان کا تبادلہ ہو گیا ہے۔ کافی پریشان ہو گئے کہ اب کیا ہوگا۔ مالی حالات اجازت نہیں دیتے تھے کہ میں ہوسٹل میں رہوں۔ والد صاحب کے ایک رشتہ کے دادا یعنی دادی کے بھائی ماسٹر

عبدالکریم صاحب کے پاس آئے جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ایک صحابی حضرت آخوند محمد رمضان کے فرزند تھے۔انہوں نے خیریت پوچھی کہ کیسے آنا ہوا۔ والد صاحب نے سارا قصہ سنایا، وہ ہماری پریشانی سمجھ گئے اور خود ہی کہا کہ کوئی بات نہیں، لڑکا ہمارے پاس رہے۔ایک سال میں ان کے گھر رہا۔ پھر بھائی حمید احمد اور بہنوں کے بارے میں فکرمند تھے کہ کیسے پڑھیں گے۔اوپر والدہ صاحبہ کا بھی والد صاحب پہ زور تھا کہ نواب شاہ شفٹ ہوتے ہیں۔ بہر حال اولاد کی خاطر والد صاحب کو نواب شاہ شفٹ ہونا پڑا۔گاؤں میں جو زمین تھی، وہ بھی ہماری خاطر بیچ دی۔ دادی جو ہمارے ساتھ رہتی تھیں، انہوں نے نواب شاہ جانے سے انکار کر دیا اور پھوپھی کے پاس یعنی اپنی بیٹی کے پاس رہنے لگیں۔ رشتہ دار بھی مخالفت کرتے تھے کہ شہر میں خرچہ زیادہ ہوتا ہے۔خود کھائے گا یا بچوں کو پڑھائے گا۔والد صاحب اور والدہ صاحبہ نے ہمت نہ ہاری۔ہماری خاطر دونوں نے فاقے کاٹے، کپڑوں پہ پیوند بھی لگائے لیکن ہمیں کوئی تکلیف نہ ہونے دی۔ میں انجینئرنگ میں select ہو گیا، گھر کا خرچہ چلانا مشکل ہو گیا۔ چھوٹا بھائی حمید احمد پارٹ ٹائم جاب کرتا تھا۔اس لئے اس کی تعلیم پر اثر پڑا اور سائنس نہ پڑھ سکا۔وہ پرائیویٹ امتحان دے کے M.A. تک پڑھ گیا۔اللہ تعالیٰ نے والد صاحب اور والدہ صاحبہ کی قربانیوں کو رنگ لایا اور آج ماشاء اللہ ہم سارے بہن بھائی پڑھ لکھ گئے۔والد صاحب بہت خوش ہوئے کہ دیکھو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمیں پھل مل گیا۔اب وہ چھوٹے بھائیوں کو محنت کرنے کی نصیحت کرتے رہتے تھے اور پرانے قصے بتایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ غلام حیدر اور حمید احمد نے ہمارے غربت کے دنوں میں مشکل حالات میں تعلیم حاصل کی۔ اب تو ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا سب کچھ ہے۔اور محنت کرو اور زیادہ شوق سے پڑھو۔

والد صاحب مجھ سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ جب میں انجینیئرنگ میں پڑھتا تھا تو مجھے Typhoid ہو گیا۔ ایک مہینہ تک بستر پہ رہا۔ کافی کمزور ہو گیا۔ والد صاحب اور والدہ صاحبہ بہت پریشان تھے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے شفا دی اور ٹھیک ہو گیا۔ ہمارے کسی رشتہ دار نے کہا کہ انجینئرنگ پڑھنا بہت مشکل کام ہے۔ غلام حیدر زیادہ پڑھائی کی وجہ سے بیمار ہو گیا ہے۔ جب میں ٹھیک ہوا تو میرے لئے کھانے کو خاص انتظام کرتے، کبھی گوشت لاتے، کبھی مغز لاتے، فروٹ لا کے کھلاتے۔ باوجود غربت کے دنوں میں مجھے کھلاتے رہتے، بادام لے آتے اور صبح کو سویرے والد صاحب اور والدہ صاحبہ بادام کی تھادل بنا کر مجھے پلاتے، دعائیں کرتے، اتنی مشفقت تھی، محبت تھی ہم بھائی بہنوں سے جو زندگی کے آخری دنوں تک رہی۔

والد صاحب کی مجھ سے محبت کی ایک اور لازوال مثال اپنی مثال آپ ہے۔ میں نے انجینئرنگ پاس کی۔ پہلے ڈیڑھ سال ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت کی۔ اس دوران میری منگنی ڈاکٹر فقیر محمد میمن صاحب مرحوم کی بیٹی سے ہوگئی۔ اس وقت گھریلو حالات صحیح نہیں تھے۔ منگنی کو دو سال ہو گئے۔ والد صاحب اور والدہ صاحبہ بہت فکر مند تھے کہ شادی کے لئے پیسے کہاں سے لائیں اور پھر ریٹائر ہونے کا فیصلہ سنا دیا۔ اس وقت والد صاحب کی عمر ۴۸ سال تھی۔ مزید ۱۲ سال سروس کر سکتے تھے۔ مگر میری خاطر ریٹائر ہو گئے اور میری شادی ہوگئی۔ میرے ایک دوست کے والد جو خود بھی والد صاحب کے ساتھ ٹیچر تھے، ایک دن کہنے لگے کہ جو تمہارے والد نے قربانی دی ہے، وہ کہیں نہیں ملتی، تمہارے باپ کی یہ عظیم قربانی ہے۔

والد صاحب کے رشتہ کے دادا مرحوم ماسٹر عبدالکریم صاحب کئی دفعہ والد صاحب کو کہتے کہ تم تو بے نظیر ہو۔

والد صاحب نے ساری زندگی ہماری خدمت کی لیکن کبھی نہیں جتایا کہ میں نے تمہارے لئے یہ کیا، وہ کیا، کبھی نہیں۔ کسی کا اپنے اوپر احسان محسوس کرتے تو اس کا شکر گزاری کا اظہار کرتے۔ وہ تو تھے ہی اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے۔ کبھی کسی سے گلہ نہیں کیا، کبھی اپنا احسان نہیں جتایا۔ بس دوسروں کے گن گاتے تھے۔

والد صاحب اکثر باتوں باتوں میں مجھے کہتے کہ بیٹا تم اپنے بھائیوں اور بہنوں اور ہمارا خیال رکھتے ہو اور میرا شکریہ ادا کرتے۔ میں شرم سے ڈوب جاتا کہ دیکھو والد صاحب دوسروں کا تو شکریہ ادا کرتے ہیں لیکن اپنی اولاد جن کا فرض ہے والدین اور بھائی بہنوں کی خدمت کرنا، ان کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ بس وہ تو مجسمہ شکر تھے۔

والد صاحب ہمیشہ آہستہ بولتے تھے۔ نرمی سے بولتے تھے، کبھی کسی سے اونچی آواز میں بات نہیں کی۔ ہمیشہ دھیمی اور اخلاق کے اندر رہتے ہوئے باتیں کرتے تھے۔

مجسمہ محبت و شفقت: والد صاحب ہم سب سے بہت ہی زیادہ پیار کرتے تھے۔ میری فیملی حیدر آباد میں رہتی ہے۔ سلیم احمد اور خالد احمد بھی میرے ساتھ حیدر آباد میں رہتے ہیں۔ بھائی حمید احمد اپنی فیملی کے ساتھ کراچی میں رہتے ہیں۔ بہن منیرہ زاہد بھی کراچی میں رہتی ہیں۔ والد صاحب، والدہ صاحبہ اور بہن حمیدہ اور بہن مختار جبیں نواب شاہ میں رہتے تھے۔ ہم لوگ جب عید پر یا کسی فنکشن میں نواب شاہ جاتے، کبھی بچوں کی چھٹیوں میں جاتے، نواب شاہ میں اکٹھے ہوتے تھے تو والد صاحب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا تھا۔ ہر ایک کو باری باری پیار کرتے، گلے لگاتے، ماتھا چومتے، چھوٹے بچوں کو گود میں اٹھا کے پیار کرتے، ان کی خیریت پوچھتے، پڑھائی کے متعلق پوچھتے۔ میرے بچے ماشاء اللہ سارے

اپنی کلاسوں میں اچھی پوزیشن لیتے تو والد صاحب بہت خوش ہوتے، کھانے کا خاص انتظام کرواتے، فروٹ بازار سے لاتے، دودھ والے کو زیادہ دودھ کا کہتے اور پھر جو خاص بات تھی کہ ہر ایک کو باری باری کہتے کہ کتنے کمزور ہو گئے ہو، اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے ہو۔ بچے بھی کمزور ہو گئے ہیں۔ مجھے کہتے کہ تم کھانا کھانے میں بہت سست ہو اور پھر کھانا تیار ہوتا، سب لوگ اکٹھے کھاتے تو میری پلیٹ میں گوشت نکال کے دیتے، پلیٹ بھر کے دیتے، میں انکار کرتا، والد صاحب اصرار کرتے، زبردستی کھانا کھلاتے، پیار بھری ڈانٹ سے کہتے کہ تم بہت سست ہو، کم کھاتے ہو، زیادہ کھایا کرو، صحت صحیح رہے گی، خود کھاؤ اور بچوں کو بھی کھلایا کرو۔ فروٹ روز گھر لایا کرو اور سب سے لڑتے رہتے کہ صحت کا خیال رکھو۔ چھوٹے بچوں سے بہت پیار کرتے اور وہ والد صاحب کے ساتھ بہت مانوس تھے۔ رات کا ٹائم ہوتا، والدہ صاحبہ کو کہتے کہ غلام حیدر کو دودھ کا گلاس بھر کے دو۔ خود دیکھتے کہ گلاس بھرا ہوا ہے کہ نہیں۔ میں انکار کرتا اور کہتا کہ دوسروں کو پورا حصہ ملنا چاہیئے تو کہتے تم پیو، دوسروں کو بھی ملے گا۔ والد صاحب کو دودھ بہن حمیدہ یا مختیار دیتی تھیں۔ وہ گلاس بھر کے لاتیں تو ان کو کہتے کہ کم کر کے لاؤ، وہ کم کر کے آتیں، پھر کہتے کہ اور کم کرو۔ اس طرح دو تین دفعہ کم کرواتے۔ ایک دن حسب معمول بہن مختیار کو دو دفعہ کم کرنے کا کہا، وہ بھی تنگ ہو گئی اور دودھ زیادہ ہی کم کر دیا اور گلاس والد صاحب کو تھما دیا۔ والد صاحب گلاس میں تھوڑا دودھ دیکھ کے ہنسنے لگے اور کہنے لگے کہ اتنا تو میں نے کم کرنے کے لئے نہیں کہا تھا۔ اس پہ سب ہنسنے لگے۔ بہن مختیار کہنے لگی کہ ابا، اب تو آپ آئندہ کم کرنے کے لئے نہیں کہیں گے۔ اتنی محبت تھی، ہم سب اولاد کو بچہ سمجھتے تھے اور نصیحتیں کرتے کہ زمانہ خراب ہے اور خاص طور پر سلیم احمد اور خالد احمد کو سمجھاتے کہ بیٹا، اچھے لڑکوں سے دوستی رکھو۔

واقعہ شہادت: ۱۹ اکتوبر جمعہ کا دن ہے۔ والد صاحب تیاری کر رہے ہیں، جمعہ کی نماز پہ جانا ہے۔ جانے سے پہلے چھوٹی بہن مختار جبین کو کہتے ہیں کہ بیٹا ۵۰ روپے تمہارے پاس کھلے ہیں۔ وہ ۵۰ روپے لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ۔/۳۳۰ روپیہ چندہ دینا ہے، ۔/۲۵۰ میرے پاس ہیں، ۵۰ روپے کم تھے، اس لئے میں نے تم سے لئے ہیں۔ جمعہ پڑھنے جاتے ہیں۔ جمعہ پڑھنے کے بعد سب سے گلے ملتے ہیں۔ بڑھوں سے ملتے ہیں، چھوٹوں سے ملتے ہیں، پیار کرتے ہیں۔ سیکرٹری مال چوہدری محمد اکرام صاحب کہتے ہیں کہ ماسٹر صاحب میرے سامنے کھڑے ہوگئے۔ اور لوگ چندہ دے رہے تھے، رش تھا۔ میں نے سوچا کہ ضرور ماسٹر صاحب کو مجھ سے کام ہے۔ لوگوں کو ہٹایا اور ماسٹر صاحب کو کہا کہ آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے۔ ماسٹر صاحب کہتے ہیں کہ چوہدری صاحب، یہ ۔/۳۳۰ روپے لے لیں، آپ نے ۔/۳۰۰ میرا بقایا ادا کیا ہوا ہے۔ مجھے یاد نہیں تھا۔ میں نے کہا، مجھے تو یاد نہیں ہے، آپ روپے اپنے پاس رکھیں، میں حساب دیکھوں گا، بعد میں آپ سے لوں گا۔ لیکن ماسٹر صاحب مصر ہیں کہ روپے لے لیں کہتے تھے مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ مجھے روپے دے دیتے ہیں اور ہاتھ ملا کے چلے جاتے ہیں۔ صبح کو فون آتا ہے کہ ماسٹر صاحب شہید ہوگئے ہیں۔ شاید اللہ تعالیٰ نے ان کو بتایا ہوگا کہ میرے پیارے بندے اپنا حساب چکا لے، اب تیرا اس دنیا سے جانے کا وقت ہوگیا ہے۔

۱۰ اکتوبر کا دن ہے۔ والد صاحب نے فجر کی نماز اوپر ادا کی اور پھر نیچے آئے۔ قرآن شریف کی تلاوت کی تیاری کر رہے تھے کہ مکان کا گیٹ کسی نے کھٹکھٹایا۔ صبح کے ۰۰۔۶ بجے کا وقت تھا۔ والد صاحب گیٹ کھولتے ہیں۔ باہر آ کے دیکھتے ہیں کہ کوئی نہیں ہے۔ اتنے میں دوسری طرف والا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ والد صاحب باہر ہی سے اس طرف جاتے ہیں۔ وہاں ایک منحوس

مولوی نقاب اوڑھے کھڑا تھا اور ماوؤزر ہاتھ میں تھا۔اس نے دو فائر کیے۔دو گولیاں ان کے پیٹ میں لگیں اور ان کی پیٹھ سے باہر نکل گئیں۔مولوی بھاگ گیا۔والد صاحب لڑکھڑائے،دیوار کو سہارا لے کے اندر گیٹ میں داخل ہوتے ہیں اللہ کر کے بیہوش ہو جاتے ہیں۔گھر والے تو جاگے ہوئے تھے،فوراً نیچے پہنچے۔پڑوس کے کچھ مرد اور عورتیں بھی پہنچ گئے۔بھائی خالد احمد جس کی عمر ۲۱ سال ہے، نے والد صاحب کو گود میں اٹھا کے رکشہ میں بیٹھے اور ہاسپٹل لے گئے۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور کہا کہ expire ہو گئے ہیں۔والد صاحب اللہ میاں کے پاس جا چکے تھے۔انا للہ و انا الیہ راجعون. کچھ لوگوں نے قاتل دیکھا کہ نقاب اوڑھا ہوا تھا۔لیکن داڑھی نظر آ رہی تھی۔ایک قصائی نے دیکھا جو صبح کے وقت گوشت کاٹ رہا تھا۔ایک دودھ والے نے بھی دیکھا،کچھ اور لوگوں نے بھی دیکھا،سب نے دیکھا کہ مولوی تھا لیکن نقاب اوڑھے ہوئے تھا۔لوگوں نے نہیں پہچانا۔شاید ڈر کی وجہ سے یا نہیں بتاتے نام قاتل کا۔کیونکہ ہمارا خیال یہ ہے کہ قاتل اسی شہر نواب شاہ کا ہی کوئی مولوی ہے۔

والد صاحب بہت ہی رحمدل، پیار کرنے والے انسان تھے۔بقول بھائی طارق محمود کہ قاتل کو گلے لگانے کی کوشش کی ہوگی لیکن اس وحشی ظالم شخص نے اتنے رحمدل، پیار کرنے والے، ہر دلعزیز، صبر کرنے والے، تہجد گزار، بااخلاق، خوددار، مہمان نواز، بیماروں کی تیمارداری کرنے والے، غریبوں کی مدد کرنے والے، بچوں کو مفت ٹیوشن پڑھانے والے، ایک شفیق اور دعائیں کرنے والے انسان پر گولی چلا کے ان کو تو شہادت کا درجہ دلا دیا اور خود اپنی عاقبت خراب کر لی۔لاتعداد لوگ احمدی بھی اور غیر احمدی بھی آئے اور اس محلے میں اتنے زیادہ لوگ کسی کے جنازہ میں نہیں آئے جتنے والد صاحب کی شہادت کی وجہ سے آئے۔ایک جم غفیر تھا۔لوگ بلک بلک کر رو رہے تھے، اپنے پرائے، سب رو

رہے تھے۔قاتل کولعنتی اور مقتول کو شہید کہہ رہے تھے۔ ہر ایک منہ سے آواز نکل رہی تھی کہ شہید ہو گئے ہیں۔ جماعت احمدیہ کے وفود بھی آئے، کراچی، حیدرآباد، نوشہروفیروز، خیر پور، میر پور خاص، مہر کوٹ، سانگھڑ سے جماعت کے وفود آئے۔ میں چونکہ ملتان میں تھا۔۵ اکتوبر کو میں نے اپنے دفتر کا چارج لیا تھا۔ ۵ اکتوبر کو میں نے فون کیا۔نواب شاہ والد صاحب کو بتایا۔ بہت خوش ہو رہے تھے کہ چلو اچھا ہوا، چارج مل گیا۔مبارک دے رہے تھے۔ میں نے ان کو بتایا کہ میں ۱۰ اکتوبر کو آؤں گا تو بہت خوش ہو رہے تھے اور کہا کہ بیٹا ضرور آنا، یہاں نواب شاہ بھی آنا اور حیدرآباد بھی اپنے بچوں کے پاس جانا، وہ تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ جی بابا، میں نواب شاہ بھی آؤں گا اور حیدرآباد بھی جاؤں گا۔ مجھے کیا پتہ کہ یہ میری والد صاحب کے ساتھ آخری بات چیت ہے۔ ۱۰ اکتوبر صبح کے وقت میں تیار ہو کے سیدھا ملتان اسٹیشن جاتا ہوں کہ Reservation کر والوں کسی شام کی گاڑی کی۔ ریزرویشن نہیں ہو سکی۔ میں نے سوچا کہ چلو جیسے تیسے گاڑی میں چڑھ جاؤں گا اور کوئی نہ کوئی جگہ مل جائے گی۔ اور دفتر آیا۔ تقریباً دس بجے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو میرے رشتہ کے بھانجے اللہ ڈنل کی گھبرائی ہوئی آواز آئی کی نانا نذیر احمد کو گولیاں لگی ہیں اور وہ شہید ہو گئے ہیں، جلدی پہنچو۔ اللہ اللہ ایسے رحمدل انسان کو کیسے ظالم وحشی نے گولیاں ماریں۔ میں نواب شاہ کے لئے روانہ ہوا۔ رات کو آٹھ بجے پہنچا۔ سب لوگ میرا انتظار کر رہے تھے۔ کیونکہ قریباً سارے رشتہ دار پہنچ گئے تھے۔ میں نے ایک جم غفیر لوگوں کا دیکھا جو صبح سے انتظار کر رہے تھے کہ جنازہ نماز پڑھ کے جائیں۔ مجھے والد صاحب کے جنازے کے پاس لے گئے۔ میں نے والد صاحب کا چہرہ پُر نور اور مسکراتا ہوا پایا، جیسے مجھ سے کہہ رہے ہوں کہ بیٹا، اب تم ہی مجھ سے گلے ملو اور جیسے گلہ کر رہے تھے کہ اتنے دن لگا دیئے۔ مجھے تو نے بڑا

انتظار کرایا ہے۔اب مجھ سے پیار کر لے۔اب میں اپنے رب کے پاس جا رہا ہوں۔ مجھے احساس جرم ستا رہا تھا کہ میں نے والد صاحب کو دو مہینے انتظار کرایا۔ مجھ سے ملنے کے لئے کتنے بے چین ہوں گے۔ بالآخر ملاقات ہوئی تو کس طرح کہ آخری ملاقات تھی۔ والد صاحب کی شہادت صبح چھ بج کر پندرہ منٹ پہ ہوئی تھی اور رات کو آٹھ بجے جب والد صاحب کا چہرہ دیکھا تو فریش اور نورانیت سے بھرپور پایا۔اور پھر رات کو ۴۰۔۸ بجے ہم جنازہ لے کر قبرستان روانہ ہوئے۔ جنازہ کے ساتھ ایک بڑا جلوس تھا۔کاروں، جیپوں اور پک اپ کے آگے موٹر سائیکلوں کا جلوس تھا۔ بہت سارے لوگ جو پیدل تھے، پہلے ہی قبرستان جا چکے تھے، شہید کا جنازہ جا رہا تھا۔لوگ دعائیں پڑھ رہے تھے۔اور والد صاحب کتنے خوش ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے کتنے بڑے اعزاز سے ان کو نوازا ہے۔کراچی سے MTA کی ٹیم نے بھی وڈیو ریکارڈ کی۔رات کو ۰۰۔۹ بجے نماز جنازہ ہوئی اور والد صاحب کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا۔احمدیہ قبرستان میں تدفین ہوئی۔امیر جماعت احمدیہ حیدر آباد میر نور احمد ٹالپر نے دعا کرائی۔

جماعت احمدیہ نواب شاہ کے جتنے بھی احباب تھے، چھوٹے ہوں چاہے بڑے، ہر ایک کے یہی تاثرات تھے۔ بڑے کہتے تھے کہ میرا تو بھائی چلا گیا اور چھوٹے کہتے تھے کہ ہمیں تو باپ کا پیار اور دعائیں دینے والا چلا گیا۔

غیر احمدی احباب تعزیت کے لئے آئے تو کہنے لگ، کاش ماسٹر صاحب ہمیں بتاتے کہ فلاں مولوی تنگ کرتا ہے، دھمکیاں دیتا ہے تو ہم اس کو سیدھا کرتے، افسوس کہ باوجود روزانہ ملاقات کے ہمیں نہیں بتایا۔

والد صاحب کی تعزیت کے لئے تین دن تانتا بندھا رہا۔ چوتھے دن حیدر آباد سے ایک غیر احمدی دوست آئے اور کہنے لگے کہ کیا آج دوسرا دن ہے۔ ہفتہ دس دن تک تو لوگ نوابشاہ میں آتے رہے لیکن ہم حفاظتی اقدام کے طور پہ

حیدر آباد شفٹ ہو گئے ۔لوگ حیدر آباد آئے اور کہتے تھے کہ ہم نوابشاہ بھی گئے لیکن جب سنا کہ حیدر آباد شفٹ ہو گئے ہیں، یہاں آئے ہیں۔

شہادت کی خبر صبح کئی اخباروں میں آئی ۔MTA سے بھی شہادت کی خبر نشر ہوئی۔ سلسلہ کے کئی مربی صاحبان آئے ،امیر صاحبان،صدر صاحبان، احمدی، غیر احمدی غریب، امیر اپنے پرائے بہت لوگ آئے ۔کئی دنوں تک لوگ آتے رہے،تعزیت کرتے رہے۔کئی اخباروں میں آیا،سندھی اخباروں عبرت، کاوش، سندھ، آفتاب،عوامی آواز وغیرہ میں اور کچھ اردو اخباروں نے ذکر کیا۔ خاص طور پر سندھ، آفتاب اور عبرت نے خصوصی طور پر یہ تصاویر کے ساتھ خبر شائع کی ۔عبرت اخبار کے ڈسٹرکٹ رپورٹر جمال الدین بھٹی جو پریس کلب، نواب شاہ کے صدر بھی ہیں، نے والد صاحب کا گاؤں کے زمانہ سے حالات زندگی کا ذکر کیا اور خراج تحسین پیش کیا۔قاتل کی مذمت کی اور کہا کہ قاتل نے قتل تو کیا لیکن اپنے کئے پہ ضرور پشیمان ہوگا۔

حضور ایدہٗ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز سے خاکسار کی ٹیلیفون پہ بات ہوئی جس کا خلاصہ یہ ہے۔

”حضور کی آواز آئی ،السلام علیکم ،اچھا ،آپ ملتان میں ہوتے ہیں۔ آپ کے والد صاحب کی شہادت اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑا اعزاز ہے، جانا تو ویسے بھی تھا، یہ واقعہ بھی اس طرح کا ہے جس طرح ڈاکٹر عقیل صاحب کو شہید کیا گیا، وہ بھی مولوی تھا جو ڈاکٹر صاحب کو شہید کرنے کے بعد مسجد میں چھپ گیا تھا، اور یہ منحوس مولوی ہے جو ماسٹر صاحب کو شہید کرنے کے بعد مسجد میں چلا گیا۔آپ اپنے ماں، بھائی ، بہنوں کو صبر کرنے کا حوصلہ دیں ۔اکثر سندھی تعصب نہیں کرتے لیکن مذہبی انتہا پسند تو ہر قوم میں ہیں ۔اللہ تعالیٰ کی رضا پہ راضی برضا ہوں اور کس کی پیروی کروں۔“ پھر میں نے حضور سے عرض کی کہ میری امی آپ

کوسلام کہیں گی۔امی نے سلام کیا۔حضور نے بھی ''السلام علیکم'' کہا اور کہا کہ آپ کی جماعت تو بہت پرانی جماعت ہے۔اس کے بعد بات ختم ہوئی۔

خلیفۃ المسیح الرابع کا محبت بھرا خط:

بسم اللہ الرحمن الرحیم نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

پیارے عزیزم غلام حیدر بگھیو

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاۃ۔

آپ کے والد محترم ماسٹر نذیر احمد بگھیو کا واقعہ تاریخ احمدیت کا ایک باب بن گیا ہے اور یہ اعزاز آپ کے خاندان کے لئے قابل فخر ہے۔جس رنگ میں ان کو شہید کیا گیا ہے، وہ بہت ہی ظالمانہ ہے۔انا للّٰہ وانا الیہ راجعون.

اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔امید ہے کہ خدا تعالیٰ ان کی قربانی کے نتیجہ میں سندھ کی سرزمین کو شاداب کر دے گا۔میری طرف سے اپنی والدہ صاحبہ، بھائیوں اور بہنوں کو خاص طور پر پیغام پہنچائیں۔میں آپ سب کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔

اللہ تعالیٰ آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے اور راضی برضا ہوں۔

والسلام، خاکسار

مرزا طاہر احمد

خلیفۃ المسیح الرابع

قارئین! واقعہ شہادت بیان کرنے سے بعد میں اپنے نوٹ کے مطابق اس واقعہ پر بات کروں گی جو بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت کا ایک زندہ وجاوید ثبوت بیان ہوا ہے۔یہ واقعہ محترم غلام حیدر صاحب سول انجینئر ملتان نے تحریر فرمایا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ اخوند محمد رمضان صاحب

صحابی مسیح موعود علیہ السلام نے ۱۸۹۸ء میں ایک خواب کی بناء پر بیعت کی تھی۔ وہ اس طرح ذکر کرتے ہیں کہ گاؤں ماہی جاچھاں میں ایک بزرگ بظاہر مجذوب تھے۔ انہوں نے ایک خواب دیکھا اور صبح لوگوں کو کہنے لگے کہ امام مہدی پیدا ہو گئے ہیں۔ اس کی بیعت کرو۔ اور انگلی مشرق کی طرف اٹھا کر کہنے لگے کہ امام مہدی اُس طرف مہدی پیدا ہوئے ہیں اور وہ مٹی کے روڑے اور اینٹوں کی قطاریں بنا کر کہتے تھے کہ یہ امام مہدی کی جماعت ہے اور خود آگے کھڑے ہو کر امامت کر کے نماز پڑھاتے تھے۔ یہ نظارہ تمام لوگ دیکھتے تھے۔ چنانچہ اخوند محمد رمضان صاحب نے بھی ایک دن خواب دیکھا کہ امام مہدی پیدا ہو گئے ہیں اور اخباروں میں بھی پڑھا چنانچہ انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ قادیان جا کر تصدیق کی جائے چنانچہ وہ قادیان خود گئے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ہاتھ پر بیعت کر کے گاؤں واپس آئے اور لوگوں کو تلقین کی اور یقین دلایا کہ امام مہدی آ گئے ہیں چنانچہ ان کے تین نواسے احمدی ہو گئے۔

اسی طرح دوسرا واقعہ صداقتِ مسیح موعودؑ پر ایک معجزانہ اور شواہد پیش کرتا ہے۔

محترم غلام حیدر ناصر صاحب، ڈپٹی ڈائرکٹر تحریر کرتے ہیں کہ ۷۵-۱۹۷۶ء کا واقعہ ہے کہ ماہی جاچھاں گاؤں سے ایک کلومیٹر دور دریائے سندھ بہتا تھا۔ ہمارے گاؤں اور دریائے سندھ کے درمیان ایک گاؤں تھا جو یک صد گھروں پر مشتمل تھا۔ وہاں غیر احمدی قبرستان تھا جو ہمارے گاؤں سے آدھا کلومیٹر دور تھا۔ اس قبرستان میں ایک پیر بخاری مدفون تھا۔ لوگ اس کی قبر پر میلے ٹھیلے لگاتے تھے۔ اور ہمارا قبرستان بھی ۱۰۰ گز کے فاصلے پر تھا۔ سندھ کے دریا میں سیلاب آ گیا۔ دریا کا کٹاؤ غیر احمدیوں کے گاؤں کی طرف تھا۔ گاؤں بہہ گیا۔ لوگ مال مویشی لے کر کھلے آسمان کے نیچے رہنے لگے۔ گاؤں کے

بعد قبرستان کی طرف دریا کا کٹاؤ شروع ہوا۔لوگ کہتے تھے کہ پیر بخاری کے مقبرے پر آکر دریا رخ پھیر لے گا اور واپس چلا جائے گا لیکن دو دن کے اندر دریا نے سارے قبرستان کو ختم کر دیا جو کئی ہزار قبروں پر مشتمل تھا۔لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ اب قادیانیوں کے قبرستان کی باری ہے، وہ بھی ختم ہو جائے گا اور انتظار کرنے لگے۔ادھر ہم دعائیں کرنے لگے اور کہنے لگے کہ یہاں حضرت موعود مسیح علیہ السلام کے صحابی اخوند محمد رمضان اور دوسرے لوگوں کی قبریں ہیں، اللہ تعالیٰ بچائے گا۔

خدا کی قدرت، جماعت احمدیہ کے قبرستان سے محض دس پندرہ گز پہ آ کے دریا نے رخ تبدیل کر لیا۔اور تین چار کلومیٹر دور یہ کنارہ چھوڑ کر دوسرے کنارے کی طرف واپس مڑ گیا۔سبحان اللہ ہم لوگوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور نعرہ تکبیر اللہ اکبر کے نعرے لگائے۔غیر احمدی پریشان ہوئے اور سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ قادیانی بیشک جیت گئے۔اس واقعہ کو تقریباً ۲۳ سال کا عرصہ ہو گیا اور خدا کی رحمت سے ہمارا قبرستان اور گاؤں سلامت ہے۔الحمد للہ۔

نعرۂ تکبیر کے ساتھ یہاں اگر ایک اور خوشخبری شہدائے احمدیت کے لئے پیش کر دوں تو بے ساختہ اللہ اکبر کا نعرہ دل کا جواب ہوگا۔

"الفضل ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۴ء میں کشتی احمدیت کے نگہبان حضرت فضلِ عمر المصلح موعودؓ نے اپنی رائے سے نوازتے ہوئے فرمایا تھا کہ "جس قدر سلسلہ کے شہید ہوں، ان کے نام کتبہ پر لکھوائیں اور اس کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے سرہانے کی طرف لگوایا جائے تاکہ وہ ہر ایک کی دعاؤں میں شامل ہوتے رہیں اور ہر ایک کی نظر ان کے ناموں پر پڑتی رہے۔"

خاندان کا بے نظیر وجود: سبحان اللہ، ماسٹر نذیر احمد بگھیو صاحب!! آپ کو کتنی بے نظیر عظمت نصیب ہوئی اور ایک اعلیٰ مقام نصیب ہوا۔خدا کرے ایسے

جانثار اور وفا شعار احمدیت کے فدائی اور خلافت احمدیت کے شیدائی اور حقیقی جانثار بکثرت پیدا ہوں جو اپنے خون سے شجر احمدیت کی آبیاری کرنے والے ہوں۔ان شہیدوں نے خون دے کر سندھ کی زمین کو سیراب کیا ہے۔یاد رہے کہ استاد کی جیب بے شک خالی ہوتی ہے مگر اس کا دل و دماغ عطا کرنے والا ہوتا ہے۔سو آج ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو زمین سندھ کو اپنا خون و گوشت بھی عطا کر گئے ہیں۔

یونہی ہمیشہ ظلم سے الجھتی رہی ہے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

اک نظر میں

نام :	ماسٹر نذیر احمد بگھیو
والد محترم کا نام :	محترم شفیع محمد صاحب بگھیو
جائے پیدائش :	گوٹھ ماہی جاپھاں نوشہرہ فیروز
بیعت :	پیدائشی احمدی
عمر :	۵ جنوری ۱۹۳۷
قد و قامت :	
پیشہ :	استاد المکرّم
تاریخ شہادت :	۱۱۰ کتوبر ۱۹۹۸ء
آلۂ شہادت :	پستول
عہدہ بروقت شہادت :	
نماز جنازہ :	امیر جماعت احمدیہ حیدر آباد، میر نور احمد تالپور
آخری آرامگاہ :	نواب شاہ قبرستان، احمدیہ قبرستان
شمائل :	سخی، رحمدل، ملنسار، غریبوں کا سچا دوست۔ نماز روزہ کا بے حد پابند، خوش لباس اور خوش کلام۔ حقوق العباد کے ساتھ حقوق اللہ میں امتیازی مقام رکھتے تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

ھوالناصر، خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

مکرم محمد اشرف احمدی شہید

ارضِ گوجرانوالہ میں آج ایک اور شہیدِ محترم نے اپنی قربانی راہِ مولیٰ میں پیش کر دی۔ یہ توفیق خدا تعالیٰ نے محمد اشرف احمدی کو عطا کی ہے، جنہیں ابتلا اور امتحان کی راہوں پر چلتے عرصہ نہیں گزرا تھا کہ انہیں دعوتِ حق کی صدا آ گئی اور اس حق کی آواز کو انہوں نے اپنے **لھو** سے بلند تر کر دیا۔ اے اشرف شہید! آپ نے بہت سرعت سے یہ سفرِ شہادت طے کیا۔ کل تو آپ اس حق شناسی کے دائرہ میں داخل ہوئے تھے اور آج آپ نے چراغِ احمدیت کی **لو** کو ابھار دیا۔ محترم ثاقب زیروی صاحب نے آپ ایسے شہداء کرام کے لئے فرمایا ہے:

نہ بجھا سکیں انہیں آندھیاں جو چراغ ہم نے جلائے تھے
کبھی لو ذرا سی جو کم ہوئی تو لہو سے ہم نے ابھار دی

جزاک اللہ

۱۹۵۸ء میں خدا تعالیٰ نے مکرم محمد بشیر صاحب مہر کے گھر جو بیٹا پیدا کیا، وہ تین بھائیوں اور ایک بہن کا بھائی تھا۔ سات افراد پر مشتمل، سب سے بڑا بیٹا مکرم محمد اشرف صاحب، مکرم محمد یوسف صاحب، مکرم محمد ظفر اللہ صاحب، مکرم امان اللہ صاحب اور مکرمہ پروین صاحبہ، سب خاندان اپنے آبائی پیشہ میں گزر بسر کرتا رہا۔ کام مشترکہ تھا

مگر

سب سے بڑے بھائی محمد اشرف کی ملاقات ایک شخص احمدی میاں محمد صادق صاحب سے ہوگئی اور دوستی کی شکل اختیار کرگئی۔ یہ دوستی چلتی رہی اور بالآخر خیالات وتفکرات کا باہم تبادلہ ہوا۔ چونکہ محترم محمد صادق صاحب داعی الی اللہ تھے، اس لئے اپنی تبلیغی مساعی کو بروئے کار لاتے اور سلسلۂ ملاقات بڑھتا چلا گیا اور بالآخر خدا تعالیٰ نے محترم محمد صادق کو توفیق عطا کی کہ اپنے دوست محترم محمد اشرف کو اپنی ہی صف میں لا کھڑا کیا۔ کیونکہ اشرف مرحوم کو بھی جنون کی حد تک مذہب کی تلاش تھی جو مسائل باہم میاں صادق صاحب کی تبلیغ و مساعی سے حل ہوئے اور خدا تعالیٰ نے اشرف صاحب کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا گرویدہ بنا دیا۔

<u>بائیکاٹ:</u> محمد اشرف صاحب نے کھیتی باڑی کے علاوہ گھر میں ایک دکان بھی کھولی ہوئی تھی۔ شہید اشرف کو خدا تعالیٰ نے چھ بیٹے اور دو بیٹیاں عطا کی ہوئی تھیں جن کے نام ہیں۔ (۱) اشتیاق احمد احمدی صاحب۔ (۲) محمد اجمل صاحب۔ (۳) افتخار احمد صاحب۔ (۴) شہزاد احمد صاحب۔ (۵) طاہر احمد صاحب۔ (۶) خرم احمد صاحب۔ (۱) صالحہ اشرف صاحبہ۔ (۲) سعیدہ اشرف صاحبہ۔

چنانچہ

یہ دس افراد خاندان کا اس دکان پر گزر بسر ہو رہا تھا مگر بیعت کے بعد گاؤں والوں کو مخالفت کی جنونی کیفیت نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دس سال کی مقبول دکان **نامنظور** کے نعرہ میں اختتام پذیر ہوئی۔ اور یہ خاندان دکان کی آمدنی سے محروم ہو گئے۔ قبولِ احمدیت کی جزا گاؤں نے بائیکاٹ کی شکل میں دی اور محمد اشرف صاحب کے ابتلاؤں کے زمانے شروع ہو

گئے۔ اور خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو آزمایا ضرور کرتا ہے

مگر

کون جانتا تھا کہ نواحی گاؤں کے لوگ جس شخص کا بائیکاٹ کر رہے ہیں۔ وہ خدا کے حضور میں کتنا مقبول ہوگا، خدا ان کا گاہک بن کر خود آیا اور چُن کر اسے تمام گاؤں کے سامنے سرخرو کر گیا۔ وہ احمدیت یعنی حقیقی اسلام پر قربان ہوئے اور حضرت مسیح موعود مہدی علیہ السلام کی صداقت پر مہر لگا کر اپنے بیٹے اشتیاق احمد احمدی کو لوائے احمدیت تھما گئے اور اپنی تمام نسل کو پیغامِ احمدیت دے کر روحانی طور پر سیراب کر گئے۔ خدا تعالیٰ جزا عطا کرے۔ آمین

خدا تعالیٰ کسی کا احسان نہیں رکھتا: یقیناً یہ ایک مستند حقیقت ہمارے سامنے محترم محمد اشرف شہید کی شہادت اور جانبازی نے رکھ دی ہے کہ خدا تعالیٰ کسی کا احسان نہیں رکھتا اور بدلہ اجر کی شکل میں دس گنا زیادہ دیتا ہے۔ مثلاً ایک دن وہ تھا کہ محمد اشرف صاحب کو کوئی جانتا نہیں تھا، مگر جب وہ خدا کے سچے بندے اور انعام یافتہ اشرف بن گئے تو آج ہزاروں ان کا نام احترام سے لیتے ہیں، کئی دلوں پر وہ دستک دے رہے ہیں تا آنکہ ان کے راستے روشن ہو جاویں۔ حد تو یہ ہے کہ خداوند عالم ان کی شہادت دے رہا ہے کہ وہ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے اور خدا تعالیٰ انہیں رزق فراہم کرے گا۔

اصل میں یہ ایمان بالغیب کا معراج ہے کہ لوگ شہادت کے انعام سے جب نوازے جاتے ہیں تو اپنے ورثاء کو بھی انعام کا حق دار بنا جاتے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ خدا تعالیٰ شہید کو رزق دیتا ہے اور اپنی جناب سے اس کے لئے عزت واحترام کا مقام عطا کرتا ہے، اس کے نام سے پہچانے جانے والا ہر شخص عظمت کے دائرہ میں آجاتا ہے۔ مثلاً میرے معاشرہ میں جہاں خالصتاً اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہادت عقائد کی بناء پر ہو رہی ہے، وہاں بیٹے کی ماں شہید کی ماں

کہلاتی ہے، اسے ایک عظمت وحرمت حاصل ہے، وہ فخر سے اپنے بیٹے کے رتبے کا اظہار کرتی ہے اور اسی طرح شوہر کی شہادت نے بیوی کو معتبر کر دیا ہے، شہید کی بیوی قابلِ ستائش ہے۔ خاوند کی وفات سے وہ بیوہ قابلِ رحم قرار دی جاتی ہے مگر شہید کی بیوہ کا ایک اعلیٰ مقام ہے کیونکہ اس کے شوہر کی شہادت نے بیوی کے لئے ایسا اثاثہ چھوڑا ہے جو اسے مجلس میں، محفل میں، جلسے اجلاس میں قابلِ احترام بنایا گیا ہے۔ وہ انعام تقسیم کرتی ہے۔ وہ شناسا لوگوں کی فہرست میں شامل کی جاتی ہے کیونکہ اس کا شوہر اپنی شہادت سے اسے انعام کا حقدار بنا گیا ہے۔

اَلخَیرُ کُلُّہٗ فی القُرآن: خدا تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ''تمام قسم کی بھلائیاں قرآن میں ہیں'' حضور فرماتے ہیں کہ تمہاری فلاح اور نجات کا سرچشمہ قرآن میں ہے۔ کوئی بھی تمہاری ایسی دینی ضرورت نہیں جو قرآن میں نہ پائی جاتی ہو۔ تمہارے ایمان کا مصدق اور مکذب قیامت کے دن قرآن ہے۔۔۔ آپ نے مزید تاکیداً فرمایا کہ قرآن ایک ہفتہ میں انسان کو پاک کر سکتا ہے۔ اگر صوری یا معنوی اغراض نہ ہوں، **قرآن تم کو نبیوں کی طرح کر سکتا ہے، اگر تم خود اس سے نہ بھاگو۔**[1]

پس آپ نے جماعت کو تاکیداً نصیحت فرمائی کہ تم قرآن کو تدبر سے پڑھو اور اس سے بہت ہی پیار کرو، ایسا پیار کہ تم نے کسی سے نہ کیا ہو۔

جہاں تک تدبر کا سوال ہے تو قرآن مجید کو تدبر سے پڑھنے کے متعلق حضرت خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعودؓ نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت جو ہمارے پاس موجود ہے، وہ قرآن کریم ہے، اس میں جتنا زیادہ کوئی غور اور تدبر کرے، اتنی ہی زیادہ معارف اور حقائق کی کھڑکیاں کھلتی جاتی ہیں۔۔۔

---

[1] کشتی نوح، صفحہ ۳۸

قرآن کریم کو میں سمجھتا ہوں کہ **جنت کی کھڑکی** ہے، جتنا اس پر غور کیا جائے، اتنا ہی یہ کھڑی کھلتی جاتی ہے اور اس قدر فراخ ہو جاتی ہے کہ اسی دنیا میں اس کھڑکی کے ذریعے خدا تعالیٰ کو، ملائکہ کو، جنت کو، دوزخ کو، عذاب قبر کو انسان دیکھ لیتا ہے اور یہ ایک ایسا آئینہ ہے کہ جب انسان اس پر غور اور تعمق کی نظر ڈالتا ہے تو آئندہ کی وہ باتیں جو ہونی ہوتی ہیں، وہ روشن ہو جاتی ہیں اور انسان اور خدا تعالیٰ کے درمیان ایک ایسا راستہ بن جاتا ہے جس پر چل کر خدا تک پہنچ جاتا ہے۔ گویا قرآن کریم ایک ایسا ذریعہ اور واسطہ ہے جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ہے، جس کے ذریعے انسان خدا تک پہنچ سکتا ہے۔ [1]

پس جہاں تک تدبر سے قرآن پڑھنے کا تعلق ہے تو شہید اشرف مرحوم کا علم قرآن سے تعلق ہے جو ہمیں ان کے بیٹے مکرم اشتیاق احمد صاحب نے لکھا ہے جسے پڑھ کر ایک مصدقہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بیشک قرآن مجید سے محبت کرنا، تدبر سے اسے پڑھنا اور تفکر سے اس کی اطاعت کرنا، انسان کو درجۂ کمال تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کا وہ انعام ہے جو بلا عمل ملتا ہے اور عمل کے ساتھ ترقی کرتے کرتے درجۂ شہادت تک پہنچا دیتا ہے بلکہ بانیٔ سلسلہ احمدیہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید تم کو نبیوں کی طرح کر سکتا ہے۔

مکرم شہید نے خلیفۃ الرابع حضرت مرزا طاہر احمدؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور حضرت مسیح اقدس موعود علیہ السلام کے ارشادات پر عمل کرنے کی کماحقہٗ کوشش کی۔ وہ اکثر ستائے گئے، ان کا گاؤں والوں نے بائیکاٹ کیا اور چلتی ہوئی دکان کو ختم کروا دیا کہ مرحوم کو دوسری سروس میں معاشی صورت حاصل کرنی پڑی۔ مگر جو دلجمعی قرآن کی تعلیم میں انہیں نصیب ہوئی، ان کی دنیا بالکل بدل گئی۔ وہ جانتے تھے کہ ابتلا کے ادوار میں سے گزروں گا تو روحانیت کا معراج پالوں گا،

---

[1] خطبات جمعہ، جلد اول، صفحہ ۲۹۳

انشاء اللہ۔ چنانچہ وہ کبھی دل برداشتہ نہ ہوئے بلکہ قرآن پاک سے حد درجہ پیار کرنا شروع کر دیا۔ اشتیاق احمد لکھتے ہیں کہ ''اگرچہ مرحوم نے قرآن و حدیث کے علوم میں کوئی امتیازی ڈگری حاصل نہیں کی تھی تاہم وہ اس کی گہرائیوں میں غوطہ زن ضرور ہوتے تھے۔

مطالعہ کا شغف: بعض وجوہ کی بناء پر محترم اشرف شہید تعلیمی لحاظ سے مڈل تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ مگر ان کے استاد المکرّم کا کہنا ہے کہ وہ شگفتہ اور مزاحیہ طالبعلموں میں سے تھے۔ مگر جب خدا تعالیٰ کسی شخص کو چن لیتا ہے تو اس کے تمام کام روحانی ترقی کی طرف گامزن ہو جاتے ہیں۔ (گو ابتلائیں اس کا مقدر ہوتی ہیں اور اسے سنوارنے میں بھی ابتلاء کا ہی ہاتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس شگفتہ اور مزاحیہ طالب علم کو کسی نہ کسی طرح روحانی غذا خدا تعالیٰ نے عطا کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ سچ بھی یہی کہ مطالعہ روح کی غذا ہے۔ روح زندہ رہے گی تو جسم بھی زندہ رہے گا۔ عبادت اور اچھی کتب کا مطالعہ ایک ایسی غذا ہے کہ جو احیاء کا کام کرتی ہے اور انسانی دل ودماغ کو زندہ رکھتی ہے۔

قارئین کرام! مجھے یاد آیا، ایک دفعہ ایک صاحب حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ کی بہت سے پیاری پیاری باتیں کر رہے تھے۔ دوران گفتگو انہوں نے کہا کہ ''حضور کتابوں کی فراہمی میں ایک امتیازی مقام رکھتے تھے''۔ اور یہ بات مجھے بہت پیاری لگی، یعنی حضرت خلیفہ اولؓ احباب کو کتابیں مہیا کرنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔

اسی طرح سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خوشنودی سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ آپ فرماتے ہیں کہ نورالدین ہمیشہ کتاب کو احباب تک پہنچانے میں انتھک کوشش کرتے ہیں، اشاعت سے پہلے ہی رقوم فراہم کرتے ہیں اور اشاعت کے بعد بھی جماعت میں فروخت کر دیتے ہیں، گویا جماعت تک

پہنچانے کا انتظام کماحقہٗ ایسا ہوتا ہے کہ ہر فرد بشر آنے والی کتاب کے مطالعے سے مستفید ہو جاتا ہے۔

چنانچہ سچ یہی ہے کہ مطالعہ روح کی غذا ہے۔ اور مطالعہ نہ کرنا علم کی آفت ہے اور مطالعہ کر کے بھول جانا سب سے بڑی آفت ہے۔ ہاں، انسان کی آفت یہی ہے کہ وہ پڑھا لکھا ہو کر بھی سچے علم سے فائدہ نہ اٹھائے بلکہ خشک ٹہنی کی طرح ہو کر بے ثمر ہو جائے۔

سچا علم: اور سچا علم ایک ایسا خزانہ ہے جو ہمیں خدا سے جا ملاتا ہے اور ہماری روح تازگی پا جاتی ہے اور علم میں وہ ثمرات پیدا ہوتے ہیں جو صرف اور صرف محمدؐ مصطفیٰ سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے دستر خوان پر ہی نصیب ہوتے ہیں۔ ہر ورق، ہر لفظ اور ہر حرف ہمیں خدا کے محبوب وجہ تخلیق کائنات کا چہرہ دیکھا تا ہے اور وہ ہے **روحانی خزائن** جو روحانیت کا نچوڑ ہے اور حضرت اقدس کی ذات بابرکات آپ کے عشق کی ایک اعلیٰ ترین مثال ہے۔

پس

سچا علم انسان کو سچ کی طرف لے جاتا ہے اور یاد رہے کہ سچ ہی تو خدا کا چہرہ دکھاتا ہے۔ اور محمدؐ اشرف شہید نے سچا علم حاصل کر کے فرشتوں سے جا مصافحہ کیا اور یہی اس کا معراج تھا۔

معذرت

قارئین! آپ سے معذرت ضروری ہے کیونکہ میں شہید اشرف صاحب کے واقعات وحالات زیادہ تفصیل سے مکمل نہیں کرسکی اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کے بیٹے اشتیاق احمد صاحب بیرون ملک جا چکے ہیں اور میرے سوالات کے جواب ادھورے ہی رہ گئے ہیں۔ لہٰذا از خود میں کیسے ضبط تحریر میں لاؤں۔ مختصر حاضر خدمت ہے۔

حفیظۃ الرحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

ھوالناصر، خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

شہدائے کرام کے ورثاء اور عزیز رشتہ داروں کے لئے الٰہی وعدہ اور خوشخبری

وَلَنَبلُوَنَّکُم بِشَیءٍ مِّنَ الخَوفِ وَالجُوعِ
وَنَقصٍ مِّنَ الاَموَالِ وَالاَنفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ط
وَبَشِّرِ الصّٰبِرِینَ الَّذِینَ اِذَآ اَصَابَتهُم مُّصِیبَةٌ لا
قَالُوٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیهِ رٰجِعُونَ اُولٰئِکَ عَلَیهِم
صَلَوٰتٌ مِّن رَّبِّهِم وَرَحمَةٌ قف وَاُولٰٓئِکَ هُمُ
المُهتَدُونَ ٥ (آیات کریمہ نمبر ۱۵۶، ۱۵۷۔ البقرہ)

ترجمہ: ”اور ہم تمہیں کسی قدر خوف اور بھوک (سے) اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی (کے ذریعہ) ضرور آزمائیں گے اور (اے رسولؐ) تُو (ان) صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنا دے جن پر جب (بھی) کوئی مصیبت آئے

(گھبراتے نہیں بلکہ یہ) کہتے ہیں کہ ہم (تو) اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔''

یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے برکتیں (نازل ہوتی) ہیں اور رحمت (بھی) اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔''

ان آیات کریمہ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے بندوں شہدائے کرام کا تذکرہ محبت بھرے الفاظ میں فرمایا تھا کہ۔۔۔۔

''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں، ان کے متعلق (یہ) مت کہو کہ وہ مردہ ہیں (وہ مردہ) نہیں بلکہ زندہ ہیں مگر تم نہیں سمجھتے۔'' (ترجمہ آیت کریمہ نمبر ۱۵۵/البقرہ)

اب ان ابتلاؤں کا ذکر فرماتا ہے جو خدائے قدوس کے قرب کے حصول کے لئے ان شہدائے کرام پر وارد ہوئے اور انہوں نے صدق دل سے اللہ تعالیٰ کی محبت کا رِضْوَانٌ مِنَ اللّٰہِ اَکْبَر کا عارفانہ نعرہ لگاتے ہوئے رَؤُفٌ بِلعِبَادَ کے حضور جان کا نذرانہ پیش کر دیا۔

ان آیات کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت مصلح موعود (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) تحریر فرماتے ہیں:

''اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پانچ قسم کے ابتلاؤں کا ذکر فرمایا ہے اور کہا ہے کہ ہم اپنی ذات کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تم ان ابتلاؤں میں سے گزرے بغیر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں کر سکتے''۔۔۔۔ یہاں حضور نے ادنیٰ درجہ کے مومنوں پر اور اعلیٰ درجہ کے مومنوں پر جو ابتلا آتے ہیں، ان کا ذکر فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:

''ادنیٰ درجہ کے مومنوں پر جو ابتلا آتے ہیں، وہ تو اس لئے آتے ہیں کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ ان کی ایمانی حالت کیسی ہے؟ اور جو اعلیٰ درجہ کے مومنوں

پر آتے ہیں، وہ اس لئے آتے ہیں کہ دوسروں کو معلوم ہو جائے کہ ان کی کیا حالت ہے؟ عام طور پر لوگ اپنے متعلق خیال کرتے ہیں کہ انہیں ایمان میں ثباتِ قدم حاصل ہے مگر موقعہ آتے ہی ان کے کمزوری آجاتی ہے اور ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے اندر یہ کمزوری ہے۔ اور وہ اس کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اعلیٰ درجہ کے لوگوں پر ابتلاء اس لئے لائے جاتے ہیں تاکہ دوسروں کو معلوم ہو جائے کہ یہ کیسے اعلیٰ مقام پر پہنچے ہوئے ہیں کہ کوئی مصیبت ان کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہیں کرتی۔ غرض بتایا کہ ہم تمہارے اندونہ کو ظاہر کرنے لئے پانچ قسم کے ابتلاء تم پر وارد کریں گے"۔۔۔۔

(آیت ۱۵۶، سورۃ البقرہ، صفحہ ۲۹۴، تفسیر کبیر)

اس آیت کریمہ کے بارہ میں حضرت مسیح موعود (اللہ تعالیٰ کی آپ پر سلامتی ہو) فرماتے ہیں:

"یعنی اے مومنو، ہم تمہیں اس طرح آزماتے رہیں گے کہ کبھی کوئی خوفناک حالت تم پر طاری ہوگی اور کبھی فقر و فاقہ تمہاے شاملِ حال ہوگا اور کبھی تمہارا مالی نقصان ہوگا اور کبھی جانوں پر آفت آئے گی اور کبھی اپنی محنتوں میں ناکام رہو گے اور حسب المراد نتیجے کوششوں کے نہیں نکلیں گے اور کبھی تمہاری پیاری اولاد مرے گی پس ان لوگوں کو خوشخبری ہو کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم خدا کی چیزیں اور اس کی امانتیں اور اس کے مملوک ہیں پس حق یہی ہے کہ جس کی امانت ہے، اس کی طرف رجوع کرے۔ یہی لوگ ہیں جن پر خدا کی رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہیں جو خدا کی راہ کو پا گئے۔

(تفسیر سورۃ البقرہ از حضرت مسیح موعود، صفحہ ۲۱۹)

"۔۔۔ جیسے شہداء کو دیکھو کہ جنگ کے بیچ میں لڑتے لڑتے مارے

جاتے ہیں تو خدا کے نزدیک کس قدر اجر کے مستحق ہوتے ہیں۔ یہ درجات قرب بھی ان کو قضاوقدر سے ہی ملتے ہیں، وگرنہ اگر تنہائی میں ان کو اپنی گردنیں کاٹنی پڑیں تو شاید بہت تھوڑے ایسے نکلیں جو شہید ہوں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ غرباء کو بشارت دیتا ہے وَلَنَبۡلُوَنَّکُمۡ بِشَیۡءٍ ۔۔۔ الآیتہ ۔۔۔ اس کا یہی مطلب ہے قضاوقدر کی طرف سے ان کو ہر ایک قسم کے نقصان پہنچتے ہیں اور پھر وہ جو صبر کرتے ہیں تو خدا تعالیٰ کی عنایتیں اور رحمتیں ان کے شامل حال ہوتی ہیں کیونکہ تلخ زندگی کا حصہ ان کو بہت ملتا ہے لیکن امراء کو یہ کہاں نصیب۔

(تفسیر سورۃ البقرہ، صفحہ نمبر ۲۳۲، ۲۳۳، از حضرت مسیح موعود)

نیز حضور فرماتے ہیں:

''جب میں آپ کی ان تکلیفوں کو دیکھتا ہوں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی ان کریمانہ قدرتوں کو جن کو میں نے بذاتِ خود آزمایا ہے اور جو میرے پروارد ہو چکے ہیں تو مجھے بالکل اضطراب نہیں ہوتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ خداوند کریم قادر مطلق ہے اور بڑے بڑے مصائب شداید سے مخلصی بخشتا ہے اور جس کی معرفت زیادہ کرنا چاہتا ہے، ضرور اس پر مصائب نازل کرتا ہے تا اسے معلوم ہو جائے کیونکہ وہ نومید ہی سے امید پیدا کرسکتا ہے غرض فی الحقیقت وہ نہایت ہی قادر و کریم و رحیم ہے۔

(از مکتوبات جلد پنجم بنام حضرت خلیفۃ المسیح الاول بحوالہ صفحہ ۴۲۸ تفسیر سورۃ البقرہ از حضرت مسیح موعود)

معزز قارئین کرام! حضرت مسیح موعود (اللہ تعالیٰ کی آپ پر سلامتی ہو) کی آیات کریمہ نمبر ۱۰۴/۱۵۷ کی روح پرور تشریحات اور تفسیر سورۃ البقرہ اور حضرت مصلح موعود (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) کی تفسیر اور تشریح سورۃ البقرہ جلد دوم میں ملاحظہ کریں تو یہ ایمان افروز تفسیریں یقیناً آپ کو روحانیت او رمعرفت الٰہی کے بلند مقام پر پہنچانے کا موجب ہوں گی۔ اس ضمن میں ہم اپنے

پیارے شہید بزرگوں کے تمام اعزہ واقربا کو نہایت ادب سے خدائی بشارات کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ ہمارے جن بزرگوں کے پیارے بیٹے شہید ہوئے، ہماری جن ماؤں کے بیٹے شہید ہوئے، ہماری جن پیاری بہنوں کے خاوند شہید ہوئے، ہمارے جن معزز بہن بھائیوں کے بھائی شہید ہوئے، ہمارے جن پیارے بچوں کے والد شہید ہوئے اور سب سے بڑھ کر پیار کرنے والے امام جماعت احمدیہ کی جماعت کے معزز افراد شہید ہوئے (کیونکہ ہمارے پیارے خدائے رحیم وکریم کے مقرب بندے جو اس کی راہ میں شہید کئے گئے، وہ ہم سب کے بہت ہی پیارے ہیں)

ان سب کو

الٰہی بشارت ہے

أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وقف
وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ○ (البقرۃ:۱۵۸)

یہ خدائی وعدہ ہے اور خدائی بشارت ہے کہ جو لوگ اپنے پیاروں کی جدائی پر صبر کریں گے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمتیں اور برکتیں ہوں گی۔ اس آیت کریمہ کی تفسیر جو حضرت مُصلح موعود نے فرمائی، اس کا اقتباس درج ذیل ہے:

"اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ ارضی اور سماوی آفات پر سچے دل سے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں اپنی مغفرت سے حصہ دیتا ہے۔ یعنی وہ ان کے نقصانات کا ازالہ کرتا اور ان کی ناکامی کو کامیابی میں اور تکلیف کو راحت میں بدل دیتا ہے۔ اسی طرح ان پر اللہ تعالیٰ کا فضل حُسنِ ثناء کی صورت میں نازل ہوتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ ان کی نیک شہرت دنیا میں قائم کر دیتا ہے اور لوگوں کی زبانوں پر ان کا ذکرِ خیر جاری ہو جاتا ہے چنانچہ دیکھ لو

مسلمانوں نے اسلام کی اشاعت کے لئے کتنی بڑی قربانیوں سے کام لیا تھا۔انہوں نے اپنی جانوں اور مالوں اور اولادوں کو بے دریغ قربان کر دیا اور کسی بڑی سے بڑی مصیبت کی بھی پرواہ نہ کی۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج دشمنانِ اسلام تک بھی ان کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔۔۔

(تفسیر کبیر جلد اول جز دوم صفحہ ۳۰۳)

قرآن حکیم میں ربُّ العزت نے واضح ارشاد فرمایا ہے:

... کَتبنَا عَلٰے بَنِی اِسرَآئِیلَ اَنَّہٗ مَن قَتَلَ نفساً بِغیرِ نَفسٍ اَو فَسَادٍ فِی الاَرضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیعاً (آیت کریمہ نمبر ۳۲/المائدۃ ۵)

ترجمہ: ''۔۔۔ہم نے بنی اسرائیل پر فرض کر دیا تھا کہ (وہ خیال رکھیں کہ) جو کسی شخص کو بغیر اس کے کہ اس نے قتل کیا ہو یا ملک میں فساد پھیلایا ہو، قتل کر دے تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا۔۔۔''

اور

چودھویں صدی کے علماء۔۔فتوے جاری کرتے ہیں کہ جو شخص کسی قادیانی/مرزائی کو قتل کرے تو سیدھا بہشت بریں میں جائے گا۔

جبکہ

ہادئ برحق حضرت محمد مصطفٰے احمد مجتبٰے خاتم انبیین (فداہ ابی وامی)ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ میں مسلمانوں کو اپنے عظیم خطاب میں جس پر تا قیامت عمل کرنا ہم پر فرض ہے، ارشاد فرمایا:

حضرت جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ رسُول کریمﷺ حجۃ الوداع کے موقعہ پر میدان میں تشریف لائے اور آپؐ نے ایک تقریر کی جس میں فرمایا: اے دوستو سن لو! تمہاری ایک دوسرے کی جانیں، تمہارے ایک دوسرے کے

اموال، تمہاری ایک دوسرے کی عزتیں خدا تعالیٰ نے تم پر حرام کر دی ہیں اور تمہارے لئے ہرگز جائز نہیں کہ تم اپنے کسی بھائی کی جان کو تکلیف دو یا اس کے مال پر حملہ کرو یا اس کی عزت پر حملہ کرو جس طرح حج کا دن اللہ تعالیٰ نے عزت والا بنایا ہے ویسے ہی ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کے خون اس کے مال اور اس کی عزت کی توقیر اس نے تم پر واجب کی ہے اور جس طرح ذوالحجہ کو عزت حاصل ہے اسی طرح خدا تعالیٰ نے ادنیٰ سے ادنیٰ سے مسلمان کے خون، اس کے مال اور اس کی عزت کو مقام بخشا ہے اور جو عزت خدا تعالیٰ نے مکہ مکرمہ کو دی ہے، وہی عزت اس نے ایک ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کے خون، مال اور عزت کو دی ہے۔

پس اے ورثاء شہداء کرام! آپ کے لئے خوش خبری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں ان بزرگوں کی قربانی کے نتیجہ میں آپ کے دروازہ پر آئیں گی اور اللہ تعالیٰ کا فضل حسن ثنا کی صورت میں آپ کو دنیا میں نیک شہرت عطا کرے گا۔ انشاء اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

درخواست دعا و اظہار تشکر

سب سے پہلے ادارہ روزنامہ الفضل کی میں شکرگزار ہوں کہ انہوں نے دوبارا اپنے **موقر جریدہ** میں اعلان فرمایا کہ شہداء کے لواحقین **نگینے لوگ** حصہ دوم کے سلسلے میں مجھ سے رابطہ کریں۔ پھر وہ مہربان جنہوں نے بھرپور تعاون کر کے میرے سوالنامے کے جواب دیئے اور مجھے شہداء کے حالات سے اپنی اپنی بساط کے مطابق آگاہ کیا، ان کا شکریہ قطعی واجب اور لازم ہے۔ محبت بھرے جذبات سے انہوں نے اپنے پیاروں کے شب و روز کا ذکر لکھا۔ مستند اور تصدیق شدہ مواد حاصل کرنے کی سعی حتی المقدور میں کرتی رہی ہوں۔ الحمد للہ۔ فقط جزاھم اللہ احسن الجزاء ہی سچا اظہار تشکر کر سکتا ہے۔ ان کے اسمائے گرامی درج کرتی ہوں جنہوں نے تصدیق شدہ مواد مہیا کیا۔۔۔۔

۱۔ صاحبزادی قدسیہ صاحبہ بیگم مرزا مجید احمد صاحب وامۃ الناصر نصرت صاحبہ

۲۔ عظمیٰ فرح بنت میاں محمد اعظم صاحب وامۃ القدوس صاحبہ

۳۔ محترمہ امۃ الرفیع صاحبہ بنت ملک محمد دین صاحب، ساہیوال

۴۔ محترم ایم۔ طاہر بٹ صاحب، انسکپٹر انصار اللہ، دفتر انصار اللہ

۵۔ محترم تسنیم احمد بٹ صاحب، برادران وسیم احمد بٹ، حفیظ بٹ شہید، فیصل آباد

۶۔ محترم میاں عصمت اللہ صاحب ابن محترم میاں محمد صادق صاحب شہید

۷۔ محترمہ طاہرہ اعجاز صاحبہ بیگم ملک اعجاز احمد صاحب شہید، وزیرآباد
۸۔ محترمہ بشریٰ ایوب صاحبہ اہلیہ محترم محمد ایوب اعظم صاحب شہید، واہ کینٹ
۹۔ محترم غلام حیدر ناصر صاحب ابن محترم ماسٹر نذیر احمد صاحب بگھیو، شہید، نوابشاہ
۱۰۔ محترم اشتیاق احمد صاحب ابن محترم محمد اشرف صاحب شہید، جہلن

سب بھائی بہنوں کے ساتھ ساتھ خصوصی شکریہ کے مستحق محترم ناظر صاحب سیّد عبدالحیٔ صاحب ہیں اور میری دو بیٹیاں مہر مقیت اور قرۃ العین، جنہوں نے ہر لحاظ سے میری معاونت کی اور تمام گھریلو ذمہ داریوں سے فارغ رکھا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان تمام ہستیوں کو عمر دراز سے نوازے، فضل و رحمت کے دروازے ان پر کھول دے اور قربتِ خداوندی ان کا مقدر ہو جائے۔ آمین یا رب العالمین.

حفیظۃ الرحمٰن
بیگم میر مبارک احمد تالپور

بڑھے اُسکا غم تو قرار کھودے وہ میرے خیال سے
اٹھیں ہاتھ اپنے لئے تو پھر بھی مرے لیے ہی دُعا کرے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم　　　　نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

هوالناصر، خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

ھو اللّٰہ الذی لا الہ الا ھو عالم الغیب والشھادۃ وھو [illegible]

الرحمٰن الرحیم

کٓھٰیٰعٓصٓ: یہ حروف مقطعات صفات الٰہیہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے کاف، ھاد، عالم اور علیم اور صادق کے ہیں اور ان کا تعلق صفات الٰہیہ سے ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے حضرت علی کرم اللہ کی ایک روایت کا ذکر فرمایا ہے کہ "حضرت علیؓ کو جب کوئی بڑی مصیبت پیش آتی تو وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرتے تھے کہ یا کٓھٰیٰعٓصٓ اغفرلی یعنی اے کٓھٰیٰعٓصٓ مجھے معاف فرمادے اور چونکہ دعا کا صفات الٰہیہ سے خاص تعلق ہوتا ہے۔ اس لئے یہ روایت بتاتی ہے کہ حضرت علیؓ بھی کٓھٰیٰعٓصٓ کو صفات الٰہیہ سے قائم مقام رکھتے تھے اور جب ان حروف کو کھولا جائے تو اَنتَ کافٍ، انت ھَادٍ، یا عَالِمُ، یا صادِقُ، اے علیم اور اے صادق، خدا تو کافی اور ہادی ہے" (تفسیر کبیر، جلد چہارم، ص ۱۹-۱۸)

پس ان صفات الٰہیہ سے مستفید ہوتے ہوئے ہم پر لازم ہے کہ جب کبھی کوئی بڑی مصیبت پیش آئے تو یہی دعا کریں کہ یا کٓھٰیٰعٓصٓ، اے علیم و صادق خدا، تو کافی اور ہادی ہے۔

میری چند تصانیف جو خدا تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق کے مطابق اپنے لوگوں کی نذر کر چکی ہوں۔ الحمدللہ

۱۔ تخلیق الاول

۲۔ قرۃ العین

۳۔ دستک

۴۔ کلمہ توحید کا سفر

۵۔ محبوبات

۶۔ ازالۃ القید

۷۔ نگینے لوگ (حصہ اول)

۸۔ آئینۂ ربوبیت (مدح خیر الوریٰؐ)

۹۔ نگینے لوگ، حصہ دوم

حرفِ آخر

ہم تو رکھتے ہیں مسلمانوں کا دیں
دل سے ہیں خدام ختم المرسلین

شرک اور بدعت سے ہم بیزار ہیں
خاک راہ احمدؐ مختار ہیں

سارے حکموں پر ہمیں ایمان ہے
جان و دِل اس راہ میں قربان ہے

(ازالہ اوہام حصہ دوئم)